کتاب ''نہج البلاغہ'' کا ایک تاریخی جائزہ

حجت الاسلام مولانا سیّد علی نقی مرحوم

مولای متّقیان کے مکتوبات اور ارشادات عالیہ پر مشتمل کتاب نہج البلاغہ کو عربی زبان و ادب کے عظیم شاہکار کا درجہ حاصل ہے جس کو سید رضی نے کتابی شکل میں پیش کیا تھا جس کی اشاعت کے تقریباً دو صدی بعد بعض لوگوں نے اپنے اعتراضات ظاہر کئے اور شیخ محمد عبدہ جیسے مصری دانشور نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ عربی زبان میں نہج البلاغہ کو قرآن کے بعد دوسری عظیم الشان کتاب کا درجہ حاصل ہے فاضل مقالہ نگار نے اس کتاب کا دقیق وحکیمانہ جائزہ نہایت سادہ مگر عالمانہ انداز بیان کے ساتھ تحریر کیا ہے جو درج ذیل ہے۔(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سیّدالانبیاء والمرسلین واٰلہ الطیّبین الطّاھرین.

نہج البلاغہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا وہ مشہور ترین مجموعہ ہے جسے جناب سیّد رضی اللہ برادر شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ نے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مرتّب فرمایا تھا۔ اس کے بعد پانچویں صدی کے پہلے عشرہ میں آپ کا انتقال ہوگیا ہے۔ نہج البلاغہ کے اندازِ تحریر سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انہوں نے طویل جستجو کے ساتھ درمیان میں خالی اوراق چھوڑکر امیرالمومنین کے کلام کو متفرّق مقامات سے یکجا کیا تھا،جس میں ایک طویل مدّت انہیں صرف ہوئی ہوگی اور اس میں اضافہ کا سلسلہ ان کے آخرعمرتک قائم رہاہوگا، یہاں تک کہ بعض کلام جو کتاب کے یکجا ہونے کے بعدملا ہے اور وہاں پرلکھ دیاہے کہ یہ کلام کسی اور روایت کے مطابق اس کے پہلے کہیں پردرج ہواہے۔ یہ اندازِجمیع وتالیف خودایک غیرجانبدارشخص کے لیے یہ پتہ دینے کے واسطے کافی ہے کہ اس میں خودسیّد رضی کے ملکۂ انشاء اور قوّتِ تحریرکا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ انہوں نے صرف مختلف مقامات سے جمع آوری کرکے امیرالمومنینؑ کے کلام کو یکجا کردینے پراکتفا کی ہے یہ

پاشانی اور پریشانی جسے بحیثیت تالیف کے کتاب کا ایک نقص سمجھنا چاہیے، مقامِ اعتبار میں اس پر اعتماد پیدا کرنے والا ایک جو ہر ہو گیا ہے۔ انہوں نے مختلف نسخوں اور مختلف راویوں کی یادداشت کے مطابق نقل الفاظ میں اتنی احتیاط کی ہے کہ بعض وقت دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہو جاتا ہے کہ اس عبارت کے نقل کرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا جب کہ ابھی ابھی ہم ایسی ہی عبارت پڑھ چکے ہیں جیسے ذم اہلِ بصرہ میں، اس شہر کے تذکرے میں اس کی مسجد کا نقشہ کھینچنے میں مختلف عبارات کبھی نعامة جاثمة اور کبھی کجوء جوء طیر فی لجة بحر اور اس سے ملتے جلتے ہوئے اور الفاظ، یہ اسی طرح کا اہتمام صحت نقل میں ہے۔ موجودہ زمانہ میں اکثر کتابوں کی عکسی تصویر شائع کی جاتی ہے اور جس میں غلط کتابت تک کی اصلاح نہیں کی جاتی اور صرف حاشیہ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ بظاہر یہ لفظ غلط ہے۔ صحیح اس طرح ہونا چاہئیے۔ دیکھنے والے کا دل تو ایسے مقام پر یہ چاہتا ہے کہ اصل عبارت ہی میں غلط کو کاٹ کر صحیح لفظ لکھ دیا گیا ہوتا، مگر صحتِ نقل کے اِظہار کے لیے یہ صُورت اِختیار کی جایا کرتی ہے، جیسے قرآن مجید میں بعض جگہ تالیفِ عثمانی کے کاتب نے جو کتابت کی غلطیاں کر دی تھیں جیسے لاذبحنّہ میں لا کے بعد ایک الف جو یقیناً غلط ہے، اس لیے یہ لائے نافیہ نہیں، جس کے بعد اذبحنّہ فعل آئے بلکہ لام تاکید ہے جس سے اذبحنّہ فعل متصل ہے۔ مگر اس قسم کے اغلاط کو بھی دُور کرنا بعد کے مسلمانوں نے صحتِ نقل کے خلاف سمجھا۔ اسی طرح اِملائے قرآن گویا ایک تعبدی شکل سے معیّن ہو گیا۔ بعض جگہ رحمة کی ت لمبی لکھی جاتی ہے، بعض جگہ جنّٰت بغیر الف کے لکھا جاتا ہے۔ بعض جگہ یدعوا ایسے فعل واحد میں بھی الف لکھا ہوا ہے کہ جو جمع کے بعد غیر ملفوظی ہونے کے باجود لکھا جایا کرتا ہے۔ ان سب خصوصیّات کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے، جس سے مقصود وثاقتِ نقل میں قوّت پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح علاّمہ سیّد رضی نے جس شکل میں جو فقرہ دیکھا اس کو درج کرنا ضروری سمجھا تا کہ کسی قسم کا تصرّف کلام میں ہونے نہ پائے۔ یہ ایک ورایتی پہلو ہے جو اس تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے کہ یہ کتاب سیّد رضی رحمہ اللہ کی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہو۔

دوسرا پہلو خطبوں کے درمیان کے و منہا..... و منہ ہیں، جس میں عموماً بعد کا حصّہ قبل سے بالکل غیر مرتبط ہوتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قبل کا حصّہ قبل بعثت سے متعلق ہے یا اوائل بعثت سے اور بعد کا حصہ بعد وفاتِ رسُول سے متعلق ہے۔ یہ بھی دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہو جایا کرتا ہے۔ مگر اس سے بھی اس مقصد کو تقویّت حاصل ہوتی ہے۔ اگر سیّد رضی کا کلام ہوتا تو فطری طور پر اس میں تسلسل

ہوتا یا اگر انہیں دوموضوعوں پرلکھنا ہوتاتواسے وہ دوخطبوں میں مستقل طور پر تحریر کرتے، لیکن وہ کیا کرتے جب کہ انہیں کلامِ امیرالمومنینؑ ہی کا انتخاب پیش کرنا تھا۔ اس لیے جہاں خطبہ کا پہلا جزاور آخرکا جزدومختلف موضوعوں سے متعلق ہے اور درمیان کا حصّہ کسی وجہ سے وہ درج نہیں کررہے ہیں تونہ وہ اس کو کلامِ واحد بناسکتے ہیں نہ مستقل دوخطبے بلکہ انہیں ایک ہی کلام میں ومنہا کے فاصلے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ شکل بعض جگہ تو انتخاب کی وجہ سے ہوئی ہے اور بعض جگہ یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ سابق میں قلمی کتابوں کے سوا کوئی دوسری شکل مواد کے فراہم ہونے کی نہ ہوتی تھی اور قلمی کتابوں کے اکثر نسخے منحصر بفرد ہوتے تھے۔ اب اگر ان میں درمیان کا حصّہ کرم خوردہ ہوگیاہے یا اوراق ضائع ہوگئے ہیں یا رطوبت سے روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے وہ ناقابلِ قراءت ہے توعلاّمہ سیّدرضی اس موقع پردرمیان کا حصّہ نقل کرنے سے قاصر رہے ہیں اور حرص جمع وحفاظت میں انہوں نے اس کے قبل یابعدوسط کے وہ سطور تلاش کئے ہیں جوکسی مستقل مفاد کے حامل ہیں اور اس طرح درمیان کے حصوں میں انہوں نے ومنہا کہہ کر اس کے درج کرنے سے عاجزی ظاہرکی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس وقت علم کا ایک بڑاذخیرہ حفّاظ وادباء ومحدّثین کے سینوں میں ہوتا تھا۔ فرض کیجئے کسی اپنے اُستاد اور شیخ حدیث سے علاّمہ سیّدرضی نے کسی موقع کی مناسبت سے خطبہ کاابتدائی حصّہ سُن لیااور انہوں نے اسے فوراً قلم بندکرلیا، پھردُوسرے موقع پرانہوں نے ان کی زبان سے اسی خطبہ کے کچھ دُوسرے فقرات سُنے اور انہیں محفُوظ کرلیا اور اتنا موقع نہ مل سکا کہ درمیانی اجزاُان سے دریافت کرکے لکھتے۔ اس طرح انہوں نے اس کی خانہ پُری ومنہا کے ذریعہ سے کی۔ یہ بھی اس کی دلیل قوی ہے کہ انہوں نے اصل کلام امیرالمومنینؑ کے ضبط وحفظ ہی کی کوشش کی ہے۔ قطعاً کوئی تصرّف خودنہیں کرنا چاہا۔

تیسراشاہد اس کا خودجناب رضی کے وہ مختصر تبصرے ہیں جوکہیں کہیں کچھ خطبوں کے بعدانہوں نے اس کلام کے متعلّق اپنے احساسات وتاثرات کے اظہار پرمشتمل درج کردیئے ہیں یا بعض جگہ کچھ الفاظ کی تشریح ضروری سمجھی ہے۔ان تبصروں کی عبارت نے ان خطبوں سے متّصل ہوکر ہر صاحب ذوق عربی داں کے لیے یہ اندازہ قطعی طور پرآسان کردیاہے کہ ان تبصروں کاانشاپرداز وہ ہرگز نہیں ہوسکتا جوان خطبوں کا انشاپرداز ہے۔ جس طرح خودعلاّمہ رضی نے اپنی مایہ نازتفسیر حقائق التّنزیل میں اعجازِ قرآن کے ثبوت میں پیش کیاہے کہ باوجودیکہ امیرالمومنینؑ کا کلام جوفصاحت وبلاغت میں فوق

البشر ہے۔ مگر جب خود حضرت کے کلام میں کوئی قرآن کی آیت آجاتی ہے تو وہ اس طرح چمکتی ہے جس طرح سنگریزوں میں گوہر شاہوار بالکل اسی شکل سے اگر چہ علاّمہ سیّدرضی اپنے دور کے افصح زمانہ تھے اور عربی ادب میں معراج کمال پر فائز تھے، مگر نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ کے کلام کے بعد جب ان کی عبارت آجاتی ہے تو ہر دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کی نگاہ بلندیوں سے گر کر نشیب میں پہنچ چکی ہے۔ حالانکہ ان عبارتوں میں علاّمہ سیّدرضی نے ادبی مہارت صرف کی ہے اور اپنی حد بھر اپنی قابلیّت دکھائی ہے۔ مگر سابق کلام کی بلندی کو ہر مطالعہ کرنے والے کے لیے ایک امرِ محسوس کی حیثیت سے ظاہر کر دیا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا داخلی شاہد ہے اس تصوّر کے غلط ہونے کا وہ علاّمہ سیّدرضی کا کلام ہو۔

چوتھا امر یہ ہے کہ جناب سیّدرضی اپنے دور کے کوئی گمنام شخص نہ تھے۔ وہ دینی و دنیوی دونوں قسم کے ذمّہ دار منصبوں پر فائز تھے۔ یہ دور بھی وہ تھا جو مذہب و ملّت کے علماء و فضلاء سے بھرا ہوا تھا۔ بغداد سلطنت عباسیہ کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے مرکزِ علم و ادب بھی تھا۔ خود سیّد رضی کے استاد شیخ مفید بھی نہج البلاغہ کے جمع و تالیف کے دور میں موجود تھے۔ اس لیے کہ جناب شیخ مفید علاّمہ سیّدرضی کی وفات کے بعد تک موجود رہے ہیں اور شاگرد کا انتقال استاد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ معاصرین کو تو ایک شخص کے متعلق الزامات کی تلاش رہتی ہے، پھر شریف رضیؒ سے تو خود حکومتِ وقت کو بھی مخاصمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے جو فاطمیین مصر کے خلاف حکومت نے مرتب کیا تھا اور جس پر علاّمہ رضی کے بڑے بھائی اور ان کے والدِ بزرگوار تک نے حکومت کے تشدّد کی بنا پر دستخط کر دیئے تھے۔ مگر علاّمہ سیّدرضیؒ نے عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر اس پر دستخط سے انکار کر دیا تھا علاوہ اس کے کہ اس کردار کا شخص جو صداقت کو ایسے قوی ترین محرکات کے خلاف محفوظ رکھے اس طرح کی چھچھوری بات کر ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک پوری کتاب خود لکھ کر امیرالمومنینؑ کی جانب منسوب کر دے جس کا غلط ہونا علماء عصر سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور اگر بالفرض وہ ایسا کرتے بھی تو ان کے دور میں ان کے خلاف علماء وقت اور ارکانِ حکومت کی طرف سے اس الزام کو شدّت سے اچھالا جاتا اور سخت نکتہ چینی کی جاتی۔ حالانکہ ہمارے سامنے خود ان کے عصر کے علماء کی کتابیں اور ان کے بعد کے کئی صدی تک کے مصنّفین کی تحریریں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی میں کمزور طریقہ پر بھی ان کے حالاتِ زندگی میں اس قسم کے الزام کا عائد کیا جانا یا اس بارے میں ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی

کا ہونا موجود نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صرف بر بنائے جذبات نہج البلاغہ کے بعض مندرجات کو اپنے معتقدات کے خلاف پا کر کچھ متعصب افراد کی بعد کی کارستانی ہے جو انہوں نے نہج البلاغہ کو کلامِ سید رضی قرار دینے کی کوشش کی ہے ورنہ خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہ کے دور میں اس کے مندرجات کا کلام امیر المومنینؑ ہونا بلا تفریق فرقہ و مذہب ایک مسلم چیز تھی اور اسی لیے ان پر اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکا۔

پانچواں امر یہ ہے کہ سید رضی اعلی اللہ مقامہ کے قبل ایسا نہیں ہے کہ امیر المومنینؑ کے خطبوں کا کوئی نام ونشان عالمِ اِسلامی میں نہ پایا جاتا ہو بلکہ کتبِ تاریخ و ادب کے مُطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلم الثبوت ذخیرہ بحیثیت امیر المومنین علیہ السلام کے سید رضی رحمۃ اللہ کے قبل سے موجود تھا۔ چنانچہ مورّخ مسعودی جو علامہ سید رضی سے مقدم طبقہ میں ہیں بلکہ ان کی ولادت کے قبل وفات پا چکے تھے۔ اِس لئے کہ علاّمہ سید رضی کا دَور شباب ہی میں ۴۰۶ھ میں انتقال ہوا ہے اور مسعودی کی وفات ۳۴۰ھ میں ہو چکی تھی، جس وقت سید رضی کے استاد شیخ مفید ہی نہیں بلکہ ان کے بھی استاد شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی بھی زندہ تھے۔ مسعودی نے اپنی تاریخ ''مروج الذہب'' میں لکھا ہے کہ:

وَالّذی حفظ النَاس عنه من خطبه فی سآئر مقاماته اربعمائة و نیف و ثمانون خطبة یوردها علی البدیهة قد اول الناس ذالک عنه قولاً و عملا (مروج الذهب ،جلد ۲ .ص ۳۳ طبع مصر) لوگوں نے آپ (حضرت علی ابن ابی طالبؑ) کے خطبے مختلف موقعوں کے محفوظ کر لیے ہیں، وہ چار سو اَسّی سے کچھ زیادہ تعداد میں ہیں۔ جنہیں آپ نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا تھا، جنہیں لوگوں نے نقل قول کے طور پر بھی بتواتر نقل کیا ہے اور اپنے خطب ومضامین میں ان کے اقتباسات وغیرہ سے بکثرت کام بھی لیتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ چار سو اسّی سے کچھ اوپر خطبے اگر تمام وکمال یکجا کئے جائیں تو بلا شبہ نہج البلاغہ سے بڑی کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ جب یہ اتنا بڑا ذخیرہ سید رضی کی ولادت سے پہلے سے موجود تھا تو پھر علاّمہ سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس ذخیرہ سے کام نہ لیں اور اپنی طرف سے نہج البلاغہ ایسی کتاب تحریر کر دیں۔ ایسا اس شخص کے لیے کیا جاتا ہے جو گمنام ہو اور جس کا کوئی کارنامہ موجود نہ ہو اور اس کے اخلاف یا منتسبین خواہ مخواہ اس کو نمایاں بنانے کے لیے اس کی جانب سے کوئی کارنامہ

تصنیف کر دیں۔ صرف علاّمہ مسعودی کا یہ قول ہی اس ذخیرہ کے ثبوت کے لیے کافی تھا، جبکہ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ذخیرہ آثارِ قدیمہ کے طور پر کسی دُور دراز عجائب خانہ یا کسی ایک عالم کے متروکات میں شامل نہیں تھا جس تک رسائی کسی زحمت کی طلبگار ہوتی ہوبلکہ حفظ النّاس اور تداول الناس کے الفاظ صاف بتارہے ہیں کہ وہ عموماً اہل علم کے ہاتھوں میں موجود اور متداول تھا۔ اس کے علاوہ دَورِ عباسیہ کے یگانۂ روزگار کاتب عبدالحمید بن یحییٰ متوفّی ۱۳۲ھ کا یہ مقولہ علامہ ابن ابی الحدید نے شرحِ نہج البلاغہ میں درج کیا ہے کہ:

حفظت سبعين خطبة من خطب الاصلع ففاضت ثم فاضت

میں نے ستّر خطبے علی ابنِ طالب علیہ السّلام کے ازبرکئے ہیں، جن کے فیوض وبرکات میرے یہاں نمایاں ہیں۔

اس کے بعدابن المقفع متوفّی ۱۴۲ھ کا اعتراف ہے جسے علاّمہ حسن الذوبی نے اپنے ان حواشی میں، جوکتاب البیان والتبیین للجاحظ پر لکھے ہیں، وہ ابن مقفع کے بارے میں لکھتے ہیں۔

الظاهرانه تخرج فی البلاغة علی خطب الامام علی ولذلک کان یقول شربت من الخطب من ریاولم اضبط لها رویاففاضت ثم فاضت

غالبًا ابن المقفع نے بلاغت میں امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالبؑ کے خطبوں سے استفادہ کیا تھا اور اسی بناپروہ کہتے تھے کہ میں نے خطبوں کے چشمہ سے سیراب ہوکر پیاہے اور اسے کسی ایک طریقہ میں محدودنہیں رکھاہے تواس چشمہ کے برکات بڑھے اور ہمیشہ بڑھتے رہے اس کے بعدابن نباۃ متوفی ۳۷۴ھ یہ بھی سیّدرضی سے مقدّم ہیں اور ان کا یہ قول ہے:

حفظت من الخطابة کنزالایزیده الانفاق الاسعة وکثرة حفظت مأته فصل من مواعظ علی ابن ابی طالب.

میں نے خطابت کا ایک خزانہ محفوظ کیاہے، جس سے جتنا زیادہ کام لیاجائے، پھربھی اس میں برکت زیادہ ہی ہوتی رہے گی، میں نے سوفصلیں علی ابنِ ابی طالب کے مواعظ میں سے یادکی ہیں۔

ابن نباتہ کے اس قول کا بھی ابنِ ابی الحدید نے تذکرہ کیاہے۔

رجال کشی میں ابوالصباح کنانی کے حالات میں لکھا ہے کہ زیدابن علی ابن الحسین کو جو زیدشہید کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی شہادت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے زمانۂ امامت میں

ہوئی وہ برابر امیرالمومنینؑ کے خطبوں کو سنا کرتے تھے۔

ابوالصباح کہتے ہیں کان یسمع منی خطب امیرالمومنین علیه السّلام۔ یہ دوسری صدی ہجری کا ذکر ہے۔ اور اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک ذخیرہ خطبوں کا اس وقت بھی موجود تھا جو مسلّم طور پر حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام کی طرف نسبت رکھتا تھا۔

ان تمام مقامات پر بطور ارسال مسلمات خطب علیؑ کہنا بتاتا ہے کہ اس زمانے میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ بھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ ورنہ کئی صدی بعد جب کچھ اغراض کی بنا پر مصنّفین نے اس حقیقت کو مشکوک بنانا ضروری سمجھا تو المنسوبة الی علیؑ کہنے لگے۔ دورِ اوّل میں اس قسم کے شک وشبہ کے اظہار کرنے والی کوئی لفظ پائی نہیں جاتی۔

رجال کبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ زید ابن وہب جہنی متوفّی حدود ۹۰ھ نے جو خود حضرت امیرالمومنینؑ کے رواۃ احادیث میں سے ہیں۔ آپ کے خطبوں کو جمع کیا تھا اور اس کے بعد اور بھی متعدد افراد ہیں جنہوں نے سیّد رضی کے پہلے حضرت کے خطب اقوال کو جمع کیا تھا۔

۱- ہشام ابنِ محمد ابنِ سائب کلبی ۱۴۶ھ، ان کے جمع وتالیف کا ذکر فہرست ابنِ ندیم جزو ۷ صفحہ ۲۵۱ میں موجود ہے۔

۲- ابراہیم ابن ظہیر فرازی، ان کا ذکر فہرستِ طُوسی میں یُوں ہے: صنّف کتباً منها کتاب الملاحم وکتاب خطب علی علیه السّلام متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ منجملہ ان میں ''کتاب الملاحم'' اور ''کتاب خطب علی علیہ السّلام'' ہے۔

اور رجال نجاشی میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

۳- ابومحمد مسعد ابن صدقہ عبدی۔ ان کے متعلّق رجال نجاشی میں ہے: له کتب منها کتاب خطب امیرالمومنین علیه السّلام ان کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے ایک ''کتاب خطب علی علیہ السّلام'' ہے۔

۴- ابوالقاسم عبدالعظیم ابن عبداللہ حسنی، جن کا مزار طہران سے تھوڑے فاصلہ پر شاہ عبدالعظیم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امام علی نقی علیہ السّلام کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے جمع کردہ خطبوں کا ذکر رجال نجاشی میں اس طرح ہے: له کتب امیرالمومنین علیه السّلام.

ان کی ایک کتاب ''خطب علی علیه السّلام'' ہے۔

۵- ابوالخیرصالح ابن ابی حمادرازی۔ یہ بھی امام علی نقی علیہ السّلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ نجاشی میں ہے: له کتب منها کتاب خطب امیرالمومنین علیه السّلام
منجملہ آپ کی تالیفات کتاب ''خطب علی علیہ السّلام'' ہے۔

۶- علی ابن محمدابنِ عبداللہ مدائنی متوفّی ۳۳۵ھ۔ انہوں نے حضرت کے خطبوں کو اور ان مکاتیب کو جمع کیا جو حضرت نے اپنے عمّال کو تحریر فرمائے تھے۔ اس کا ذکر معجم الادباء یاقوت حموی جزو ۵ صفحہ ۳۱۳ میں ہے۔

۷- ابومحمدعبدالعزیز جلودی بصری متوفی ۳۳۰ھ کی تصانیف میں کتاب خطب علی، کتاب رسائل، کتاب مواعظِ علی، کتاب خطب علی علیہ السّلام فی الملاحم، کتاب دعاء علی موجود ہیں، جن کا تذکرہ شیخ طوسی نے فہرست میں اور نجاشی نے ان کی طویل تصنیفات کے ذیل میں اپنے رجال میں کیا ہے۔

۸- ابومحمد حسن ابن علی ابن شعبہ حلبی، متوفّی ۳۲۰ ھ نے اپنی مشہور کتاب تحف العقول، ص ۱۳، طبع ایران میں امیرالمومنین کے کچھ کلمات امثال و خطب کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

انّنالوا استغرقنا جمیع ماوصل الینا من خطبه و کلامه فی التوحید خاصة دون ماسواه من المعانی لکان مثل جمیع هذا الکتاب

یعنی اگر ہم وہ سب لکھنا چاہیں جو ہم تک حضرت کے خطبے اور آپ کا کلام صرف توحید کے بارے میں پہنچا ہے علاوہ دوسرے موضوعات کے تو وہ پوری اس کتاب تحف العقول کے برابر ہوگا۔

اب مذکورہ بالاتفصیل پرنظرڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی میں زیدابن وہب جہنی نے حضرت کے خطبوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ دوسری صدی میں عبدالحمید ابن یحیٰی کاتب اور ابن مقفّع کے دور میں وہ ذخیرہ مسلّم طور پر موجود تھا اور اس صدی کے وسطی دور میں وہ خطبے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔ جیسا کہ زیدشہید کے واقعہ سے ظاہر ہوا اور ادباء اس کو زبانی حفظ کرتے تھے، جیسا کہ عبدالحمید اور ابنِ مقفّع کی تصریحات سے ظاہر ہوا۔

اور تیسری صدی میں متعدد مصنّفین نے جو جو خطبے ان تک پہنچے تھے۔ ان کو مدوّن کیا۔ ایسی صورت میں جناب سیّدرضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ ان تمام ذخیروں کو نظرانداز کرکے یہ دماغی دادوکاہش گوارا کریں کہ وہ ازخُود کلام امیرالمومنینؑ کے نام سے کوئی چیز تصنیف کریں۔

چھٹا امر یہ ہے کہ ان تمام ذخیروں کے سابق سے موجود ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ علاّمہ سیّدرضی

کے لیے یہ تو قطعی ممکن نہیں تھا کہ وہ ان تمام ذخائر کو تلف کرادیتے اور پھر اسی کی ترویج کرتے جو انہوں نے کلامِ امیرالمومنینؑ قرار دیا تھا۔ یہ قطعی ناممکن تھا اگر وہ ذخیرہ کسی ایک مصنّف کے پاس کسی ایک دورودراز جگہ ہوتا تو یہ امکان بھی تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ شیخ ابوعلی سینا نے فارابی کے تمام مصنّفات کو کسی شخص سے حاصل کر کے انہیں تلف کردیا اور ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرلیا۔ یہاں یہ صورت قطعاً ناممکن تھی جب کہ وہ کلام ادبا کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اطراف واقطارِ عالمِ اسلامی میں منتشر تھا اور بہت سے مصنّفین اس کی تدوین کر چکے تھے۔ پھر جب کہ سیّد رضی کی تصنیف کے ساتھ ان ذخائر کا موجود ہونا لازمی تھا تو اگر سیّدرضی کا جمع کردہ کلام اس ذخیرہ کو دیکھے ،پڑھے ہوئے یا یاد کئے ہوئے تھے،صدائے احتجاج بلند کردیتے،ان میں تلاطم ہوجاتا اور سیّدرضی تمام دنیا میں اس کی وجہ سے بدنام ہوجاتے۔ کم ازکم کوئی ان کے ہم عصر ادبا میں سے اس کی تنقید ہی کرتا ہوا ایک کتاب ہی اس موضوع پر لکھ دیتا کہ امیرالمومنینؑ کا جو کلام اب تک محفوظ رہا یہ سیّدرضی کے جمع کئے ہوئے ذخیرہ سے مختلف ہے۔ خصوصاً جب وہ وجہ جو بعد میں ایک طبقہ کو اس بات میں انکار یا تشکیک کی موجب ہوئی،جس کی تفصیل کسی حدتک آئندہ درج ہوگی۔ وہ ایک مذہبی بنیاد تھی۔ یعنی یہ کہ نہج البلاغہ میں ان افراد کے بارے میں جنہیں سوادِ اعظم قابلِ احترام سمجھتا ہے کچھ تعریضات یا انتقادی کلمات ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سلطنتِ عباسیّہ کے دارالسلطنت میں لکھی گئی جو اہلِ سنّت کا علمی مرکز تھا۔ اس وقت بڑے بڑے علماء،حفاظ،ادبا خطبا، اہل سیر اور محدثین اہلِ سنّت میں موجود تھے اور ان کا جمِ غفیر خاص بغداد میں موجود تھا۔ اگر امیرالمومنینؑ کے وہ خطبات جو ابن المقفع ،ابن نباتہ،عبدالحمید ابن یحییٰ، جاحظ اور دیگر مسلّم الثبوت ادبا کے دور میں موجود تھے،ان تعریضات سے خالی تھے اور اس قسم کے مضامین ان میں نہ تھے بلکہ فطری طور پر اس صورت میں اس کے خلاف چیزوں پر انہیں مشتمل ہونا چاہیے تھا،تو اس وقت کے اہلِ سنّت علماء اس پر قیامت برپا کردیتے اور اس کو اپنے مذہب کے خلاف ایک عظیم حملہ تصور کر کے پورے طور سے اس کا مقابلہ کرتے اور اس کی دھجیاں اڑادیتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا،کوئی دھیمی سی آواز بھی اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ یہ اس کا قطعی ثبوت ہے کہ سیّدرضی کے جمع کردہ مجموعہ میں کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ وہ وہی تھا جو اس کے پہلے مضبوط ومدّون،متداول ومحفوظ رہا تھا،علماء قطعاً اس سے اجنبیت نہ رکھتے تھے بلکہ اس سے مانوس اور اس سننے کے اور یاد کرنے کے عادی تھے وہ اس ادبی ذخیرہ کو اس کی ادبی افادیت کے اعتبار سے سرآنکھوں پر رکھتے تھے اور اس تنگ

نظری میں مبتلا نہ تھے کہ چونکہ اس میں کچھ چیزیں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں،اس لیے اس کا انکار کیا جائے یااس سے اجنبیت برتی جائے۔

ساتواں امر یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علاّمہ سیّدرضی کے قبل کی اس وقت بھی ایسی موجود ہیں،جن میں امیرالمومنینؑ کے اکثرمواقع کے کلام یا خطبات کوکسی مناسبت سے ذکرکیاہے،جیسے جاحظ متوفّی ۲۵۵ھ کی ''البیان والتبیین'' ابنِ قتیبہ دینوری متوفّی ۲۷۶ھ کی ''عیون الاخبار''و''غریب الحدیث''،ابن واضح یعقوبی متوفّی ۲۷۸ھ کی'' مشہورتاریخ''،ابوحنیفہ دینوری متوفّی ۲۰۸ھ کی'' اخبار الطّوال''،ابوالعباس لمبرد متوفّی ۲۸۶ھ کی کتاب''المبرد'' مشہورمورخ ابنِ جریرطبری متوفّی ۳۱۰ھ کی ''تاریخ کبیر''،ابن وریدمتوفّی ۳۲۱ھ کی'' کتاب المجتبیٰ''، ابن عبدربہ متوفّی ۳۲۸ھ کی ''عقدالفرید''،ثقۃ الاسلام کلینی متوفّی ۳۲۹ھ کی مشہورکتاب'' کافی''،مسعودی متوفّی ۳۴۶ھ کی تاریخ '' مروج الذہب''،ابوالفرج اصفہانی متوفّی ۳۵۶ھ کی کتاب''اغانی''ابوعلی قال متوفّی ۳۵۶ھ کی کتاب ''النوادر''، شیخ صدوق متوفّی ۳۸۱ھ کی ''کتاب التوحید'' اور ان کے دوسرے'' جوامع حدیث''،شیخ مفید رحمہ اللہ،متوفّی ۴۱۶ھ اگر چہ تاریخِ وفات کے اعتبارسے جناب رضی سے موخّر ہیں مگران کے استاد ہونے کی وجہ سے طبقۃً مقدّم ہیں، ان کی کتاب''الارشاد'' اور''کتاب الجمل''۔ ان تمام کتابوں میں جوحضرت کے خطبے درج ہیں ان کا جب مقابلہ علاّمہ سیّدرضی کے مندرجہ خطب اور اجزاء کلام سے کیاجاتاہے تواکثرتووہ بالکل متحد ہوتے ہیں اور نہج البلاغہ میں ایسا درج شدہ کلام اگر کوئی ہے جوان کتابوں میں درج نہیں ہے۔ یاان کتابوں میں کوئی کلام ایسا ہے جونہج البلاغہ میں مذکو رنہیں ہےتواسلوبِ بیان اور اندازِ کلام،تسلسل وبلند آہنگی،جوش وحقائق نگاری کے لحاظ سے یقیناً متحد ہوتا ہے۔جس میں کسی واقف عربیت کو شک نہیں ہوسکتا۔ امیرالمومنینؑ کے اس کلام کا جونہج البلاغہ میں درج ہے ،اس تمام کلام سے، جوحضرت کی طرف نسبت دیکراور دوسری کتابوں میں درج ہے۔ متحدالاسلوب ہونا پھراس پہلو کےضمیمہ کے ساتھ جس کا پہلے تذکرہ ہوچکاہے کہ وہ خودسیّدرضی کے اس کلام سے جونہج البلاغہ میں بطورمقدّمہ یا بطورتبصرہ موجودہے۔ بالکل مختلف ہونا ایک غیرجانب دارشخص کے لیے اس کا کافی ثبوت ہے کہ یہ واقعی امیرالمومنینؑ ہی کا کلام ہے۔ جسے علاّمہ سیّدرضی نے صرف جمع کیاہے۔

آٹھواں امر یہ ہے کہ خودعلاّمہ سیّدرضی کے معاصرین یاان سے قریب العہدمتعدّدلوگوں نے

بطورخود بھی کلام امیرالمومنینؑ کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کیا ہے۔ جیسے ابن مسکویہ متوفّی ۴۲۱ھ نے ''تجارب الامم'' میں، حافظ ابونعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ نے ''علیۃ الاولیاء'' میں، شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی متوفی ۴۶۰ھ نے جو شیخ مفیدرحمہ اللہ سے تلمذ کی حیثیت سے علاّمہ رضی کے ہم طبقہ اور علم الہدیٰ سیّدمرتضی کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اور نیز سال وفات کے اعتبار سے ان سے ذرا موخر ہیں۔ اپنی کتاب'' تہذیب'' اور کتاب ''الامالی'' میں، نیز عبدالواحد ابن محمدابن عبدالواحد آمدی جو اسی عصر کے تھے اپنی مستقل کتاب ''غررالحکم'' ودررالکلم جو امیرالمومنینؑ کے مختصر کلمات پر مشتمل ہے اور مصر اور ہندوستان میں طبع ہوچکی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ نیزابوسعید منصور ابن حسین آبی وزیرمتوفّی ۴۲۲ھ اپنی کتاب ''نزہۃ'' ''الادب ونثر'' ''الدرر'' میں جس کا ذکر'' کشف الظنون'' باب النون میں ہے اور قاضی ابوعبداللہ محمد بن سلامہ قطاعی شافعی متوفّی ۴۵۳ھ جن کی عظیم الشان کتاب اس موضوع پر'' دستور معالم الحکم'' کے نام سے ہے اور وہ مصر میں طبع ہوچکی ہے۔ یہ سب تقریباً سیّدرضی کے معاصرین ہی ہیں۔ ان سب کی کاوشیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ سوائے ابوسعید منصور کی کتاب کے جس کا ''کشف الظنون'' میں تذکرہ ہے۔ باقی یہ سب کتابیں مطبوع ومتداول ہیں۔ ان میں جو کلام مندرج ہے وہ بھی علاّمہ سیّد رضی کے درج کردہ کلام سے عیناً طریقۂ کار یا اسلوب میں متفق ہی ہے ۔ پھراگر سیّد رضی کی نسبت یہ تصور کیاجائے کہ انہوں نے خوداس کلام کوتصنیف کردیاہے توان تمام جامعین اور اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کرنے والے دوسرے افراد کو کیا کہا جائے گا۔ پھران کی نسبت بھی یہی تصور کرنا چاہیے۔ جب کہ ان میں سے سب سے زیادہ افراد یقیناً جلالت شان اور ورع وتقویٰ وغیرہ میں علاّمہ سیّد رضی سے بالاترنہیں معلوم ہوتے۔ اب اگر ان سب کی نسبت یہی خیال کیاجائے توخیر علاّمہ سیّد رضی تواشعرالطالبین تھے اور کتبِ سیرانہیں خود ادبیت اور فصاحت وبلاغت میں معراجِ کمال پرظاہرکرتی ہیں،مگران میں سے ہرشخص کی نسبت تویہ تصوّرقطعی غلط ہے کہ وہ سب علاّمہ سیّدرضی ہی جیسی ادبی حیثیت کے حامل تھے پھر ایسے مختلف المرتبہ اشخاص کی ذہنی کاوشوں اورقلمی ثمرات میں اتنا ہی فرق کیوں نہیں ہے جوخود ان اشخاص کے مبلغِ علمی میں یقینی طور پرپایاجاتاہے۔ اشخاص کہ جو کلام کے جمع کرنے والے ہیں۔ ان میں آپس میں زمین وآسمان کا فرق اورکلام جوانہوں نے جمع کیاہے وہ سب ایک ہی مرتبہ،ایک ہی شان کا اسے دیکھتے ہوئے سوائے ایسے شخص کے جو جان بوجھ

کرحقیقت کے انکار کرنے پر تلا ہوا ہو اور کسی کو اس میں شک وشبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا کہ ان اشخاص کا کارنامہ صرف جمع وتالیف ہی ہے۔ جس میں ان کے سلیقہ اور ذوق کا اختلاف فقط شانِ ترتیب اور عنوان تالیف میں نمودار ہوتا ہے، لیکن اصل کلام میں ان کی ذاتی قابلیت، ذہانت اور مبلغِ علمی اور معیارِ ادبی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔

نواں امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا افراد اگر چہ اپنے زمانۂ حیات کے کچھ حصّوں میں علاّمہ سیّدرضی سے متحد ہیں، مگر ان سے متعدد افراد کے سال وفات کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہے کہ ان کا زمانہ جمع وتالیف نہج البلاغہ سے موخر ہے اور اس کے بعد ایک ایسا طبقہ ہے جو بالکل علاّمہ سیدرضی سے موخر ہی ہے۔ جیسے ابنِ ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ، سبط ابنِ جوزی متوفّی ۶۰۶ھ اور اس کے بعد بہت سے مصنفین۔ ظاہر ہے کہ علاّمہ سیدرضی کی کتاب نہج البلاغہ گوشۂ گمنامی میں اور ان لوگوں سے مخفی نہ تھی۔ ان لوگوں کا محرک اس جمع وتالیف پر صرف یہ تھا کہ علاّمہ سیّدرضی نے انتخاب سے کام لیتے ہوئے یا ماخذوں کی کمی سے یا ان نسخوں کے کرم خوردہ یا ناقص ہونے کی وجہ سے جو ان کے پاس تھے، بہت سے اجزاء کلام امیرالمومنینؑ کے نقل نہیں بھی کیے تھے۔ اس لیے مصنّفین کو مستدرک اور مستدرک در مستدرک کی ضرورت پڑتی رہی، جس کا سلسلہ ماضی قریب میں علاّمہ شیخ ہادی آل کاشف الغطاء تک جاری رہا۔ جنہوں نے مستدرک نہج البلاغہ تحریر فرمایا۔ جو نجفِ اشرف میں طبع ہو چکا ہے۔ اگر علاّمہ سیّد رضی کے قریب العہدی ان کے بعد کے اہل قلم میں کسی کو بھی نہج البلاغہ کے مندرجہ کلمات وخطب میں یہ خیال ہوتا کہ یہ جناب رضی نے تصنیف کرکے اس میں شامل کردیئے ہیں تو وہ سب بالخصوص معاصرین جو کسی رعایت کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے، اپنی کتابوں کی وجہ تالیف میں اس کا تذکرہ ضروری سمجھتے چونکہ اس کے قبل جو کتاب امیرالمومنینؑ کے خطبوں پر مشتمل کہہ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں آپ کا اصل کلام موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ساختہ و پرداختہ اور وضعی ہے۔ اس لیے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم آپ کا اصلی کلام منظرِ عام پر لائیں، جب کہ ایسا نہیں ہوا اور یہ بالکل مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ان سب کے نزدیک علاّمہ سیّد رضی نے جو کلام جمع کیا، وہ بلا شبہ کلام امیرالمومنینؑ کی حیثیت سے اس کے پہلے سے مدون و متداول تھا اور ان کو سیّد رضی سے شکایت صرف بعض خطبوں کو چھوڑ دینے یا احاطہ و استغفار نہ کرنے یا شان ترتیب وعنوان تالیف میں کسی مناسب ترصورت کو اختیار کرنے ہی کی تھی، جس کے لیے انہوں نے بھی اس بارے میں کوشش

ضروری سمجھی، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ممکن ہے کہ بعض مصنّفین اب بھی کسی خاص ترتیب سے نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب کے متمنی ہوں۔ یہ دوسری چیز ہے اور اصل کلام کے بارے میں کسی شک وشبہ کا رکھنا دوسری چیز ہے۔

دسواں امر یہ ہے کہ تلاش کی جاتی ہے تو نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب و اقوال کا پتہ۔ اب بعینہٖ الفاظ نہج البلاغہ کے قبل تالیف شدہ کتابوں میں مل جاتا ہے اور جب کہ اکثر حصّہ اس کا قبل کی کتابوں میں مندرج موجود ہے تو تھوڑا سا حصّہ اگر دستیاب نہ بھی ہو تو ایک معتدل ذہن میں اس سے کوئی شک و شبہ پیدا نہیں ہوسکتا، جب کہ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں مختلف حوادث کے ذیل میں کتابوں کے اتنے ذخیرے تلف ہوئے ہیں جو اگر موجود ہوتے تو یقیناً موجودہ ذخائر سے بدرجہا زیادہ ہوتے۔ خود تاریخ نے کلامِ امیرالمومنینؑ کے جن جمع شدہ ذخیروں کا پتہ علاّمہ سیّد رضی سے قبل ہم تک پہنچادیا ہے۔ وہ سب اس وقت کہاں موجود ہیں؟ اس لیے اگر بعض مندرجات رائج الوقت کتابوں میں نہیں بھی ملتے تو ذہن یہی فیصلہ کرتا ہے کہ ان کتابوں میں موجود ہوں گے، جن تک ہماری اس وقت دسترس نہیں ہے۔ نہج البلاغہ کے مندرجات کے ان احوال کو پہلے علاّمہ شیخ ہادی کاشف الغطاء نے ''مستدرک نہج البلاغہ'' کے اثنائے تالیف ہی میں ''مدارنہج البلاغہ'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غالباً مکمل شائع نہیں ہوا ہے اور ایک قابلِ قدر کوشش رامپور کے ایک سنی فاضل عرشی صاحب نے کی ہے، جو'' فاران'' کراچی میں مقالہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے اور مزید تلاش کی جائے تو اس سلسلہ میں مزید کامیابی کا بھی امکان ہے۔

گیارہواں امر یہ ہے کہ محقّقین علمائے شیعہ کا رویہ دیکھا جائے تو وہ ہر اس کتاب یا مجموعہ کو جو معصومین میں سے کسی کی طرف منسوب ہو بلاچوں و چرا اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوجاتے کہ وہ معصومین کی جانب منسوب ہے بلکہ وہ پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ محققانہ فریضہ کو انجام دیتے ہوئے اگر وہ قابلِ انکار ہوتا ہے تو کھل کر اس کا انکار کردیتے ہیں اور اگر مشکوک ہوتا ہے تو شک و شبہ کا اظہار کردیا کرتے ہیں اور اس طرح بہت سے وہ ذخیرے جو کلامِ معصومین کے نام سے موجود ہیں مقامِ اعتبار میں مختلف درجے اختیار کرچکے ہیں مثلاً دیوان امیرالمومنینؑ بھی تو بطور علیؑ ہی رائج ہے مگر علماء شیعہ بلارو رعایت اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اس سے ذرا بالاتر درجہ تفسیر امام حسن عسکریؑ کا ہے۔ حالانکہ وہ شہرت میں تقریباً نہج البلاغہ سے کم نہیں ہے اور شیخ صدوق ایسے بلندمرتبہ

قدیم محدّث نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر اکثر علمائے شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے، یہاں تک کہ ہمارے قریبی دور کے محقّق علاّمہ محمد جواد بلاغی نے ایک پورا رسالہ اس کے غلط ہونے کے اثبات میں لکھ دیا ہے۔ ''فقہ الرضا'' امام رضا علیہ السلام کی طرف منسوب ہے مگر اس کے اعتبار اور عدم اعتبار کی بحث ایک مہتم بالشان علمی مسئلہ بن گئی ہے۔ جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح جعفریات اور امام رضا علیہ السلام کا ''رسالہ ذہبیہ'' وغیرہ کوئی نقد و بحث سے نہیں بچا ہے۔ اس روّیہ کے باوجود سیّدرضی کے بعد سے اس وقت تک کسی دور میں بھی کسی شیعہ عالم کا نہج البلاغہ کے خلاف آواز بلند نہ کرنا اور اس میں ذرّہ بھر بھی شک وشبہ کا اظہار نہ کرنا اس کا ثبوت قطعی ہے کہ ان سب کی نظر میں اس کی حیثیت ان تمام مجموعوں سے ممتاز اور جداگانہ ہے۔ نہج البلاغہ کے ہم پلّہ اس حیثیت سے اگر کوئی کتاب ہے تو وہ صرف ''صحیفۂ کاملہ'' ہے جو اسی طرح مسلّم طور پر امام زین العابدین علیہ السّلام کے کلام کا مجموعہ ہے اور کوئی کتاب اِس ذیل میں ان دونوں کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ علاّمہ سیّدرضی کے بعد تقریباً دوڈھائی سو برس تک نہج البلاغہ کے خلاف کوئی آواز اٹھتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ متعدّد علمائے اہل سنت نے اس کی شرحیں لکھیں جیسے ابوالحسن علی ابن ابی القاسم بیہقی متوفّی ۵۶۵ھ امام فخرالدین متوفّی ۶۰۶ھ ابن ابی الحدید متوفّی ۶۵۵ھ علاّمہ سعدالدین تفتازانی وغیرہ غالباً انہیں علمائے اہلِ سنّت کے شروح وغیرہ لکھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام میں نہج البلاغہ کا چرچا پھیلا اور اس کے ان مضامین کے بارے میں جو خلفاثلاثہ کے بارے میں ہیں۔ اہلِ سنّت میں بے چینی پیدا ہوئی اور اب آپس میں بحثیں شروع ہوگئیں اور اس کی وجہ سے علماء کو اپنے اصول عقائد سنبھالنے کے لیے اور عوام کو تسلّی دینے کے لیے نہج البلاغہ کے بارے میں شکوک وشبہات اور رفتہ رفتہ انکار کی ضرورت پڑی، چنانچہ سب سے پہلے ابنِ خلکان متوفّی ۶۸۱ھ نے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اور علاّمہ سیّدمرتضٰی کے حالات میں یہ لکھا کہ:

قداختلف الناس فی کتاب نهج البلاغة المجموعة من کلام علی ابن ابی طالبؑ هل هو جمعه اواخوه الرضی و قد قیل انه لیس من کلام علی ابن ابی طالبؑ و انما الذی جمعه و نسبه الیه هو الذی وضعه واللّٰه اعلم.

لوگوں میں کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں جو امیرالمومنین ابن ابی طالبؑ کے کلام کا مجموعہ ہے اختلاف ہے کہ وہ انہی (سیّدمرتضٰی) کا جمع کردہ ہے یا ان کے بھائی سیّدرضی کا اور بعض کہتے ہیں کہ

یہ جنابِ امیرؑ کا کلام ہی نہیں ہے، بلکہ جسے جامع سمجھا جاتا ہے،اسی کی یہ تصنیف ہے۔ واللہ اعلم.

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ نہج البلاغہ کے بارے میں اختلافی آواز ڈھائی صدی کے بعد بھی نہج البلاغہ کے تالیف کے مرکز یعنی بغداد یا ملک عراق کے کسی شہر سے بلند نہیں ہوئی بلکہ مغربی مملکت جہاں بنی امیّہ کی سلطنت تھی اور قیروان و قرطبہ میں جس سلطنت کے زیر اثر علماء کی پرورش ہورہی تھی وہاں ابن خلکان مغربی کی زبان سے یہ آواز بلند ہورہی تھی یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ جنہیں اختلف الناس کہا جارہا ہے یہ مسلمان دارالخلافہ کے کوئی ذمّہ دارافراد نہیں ہیں ورنہ اختلف العلماء، اختلف المحققون، اختلف الادباء ایسے کوئی وقیع الفاظ درج کئے جاتے بلکہ یہ الناس اموی سلطنت کے پروردہ کے پروردہ مملکت مغربیہ کے سنّی عوام ہیں جنہیں یہ خبر تک نہیں ہے کہ یہ کتاب سیّدرضی کی جمع کردہ ہے یا سیّد مرتضٰی کی اور یہ جناب ابن خلکان کا تقیّہ ہے کہ وہ خود اپنی اطلاعات کو جو اس کتاب اور اس کے جامع کے بارے میں یقیناً ان کو تھی، پیش نہیں کرتے بلکہ عوام کے جذبات کی تسلّی کے لیے خود انہیں عوام کے اختلافات کی ترجمانی کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض لوگ اسے سیّد مرتضی کا جمع کردہ کہتے ہیں اور بعض سیّدرضی کا اور خود ان کے ضمیر کا فیصلہ پہلے آجاتا ہے کہ جمع کرنے والا کوئی بھی ہو،لیکن ہے وہ کلامِ امیرالمومنینؑ ہی کا اور پھر عوامی جذبات کو دھچکا پہنچنے کے اندیشے سے وہ بعض ان متعصّب مجہول الاسم والرسم اشخاص کے اس عذر کو جو اس کے مضامین کے تسلیم کرنے سے گریز کے لیے وہ مقامِ مناظرہ میں پیش کرتے تھے کہ ہم اسے کلام علیؑ ہی تسلیم نہیں کرتے وہ قیل کہہ کے ذکر کردیتے ہیں کہ بعض ایسا کہتے ہیں کہ یہ امیرالمومنینؑ کا کلام ہے ہی نہیں بلکہ جس نے جمع کیا ہے اسی نے اس کو تصنیف کردیا ہے۔ یہ خود قیل اس قول کے ضعف کے لیے کافی تھا لیکن خود ان کا ضمیر اس قیل سے چونکہ مطمئن نہیں لہٰذا آخر میں واللہ اعلم کہہ کر وہ اس میں مزید شک وشبہ کا اظہار کردینا چاہتے ہیں۔ اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن خلکان اس بارے میں اپنے فیصلے کو ماحول کے دباؤ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ صرف عوام کی باہمی چہ میگوئیوں کا تذکرہ کرکے اپنا دامن بچالے جانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تشکیک کا علمی دنیا میں کوئی وزن ہی نہیں مانا جاسکتا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے ۔اگر چہ علامہ ابن خلکان نے اپنے ضمیر کی تحریک سے بہت حد تک اپنے کو نہج البلاغہ کے انکار کی ذمہ داری سے بچایا تھا مگر ان کے ان الفاظ نے بعد والے میدان مناظرہ کے پہلوانوں کو آسانی سے یہ داؤں بتادیا کہ وہ نہج البلاغہ کے کلام امیرالمومنینؑ ہونے

کا انکار کردیں ۔ چنانچہ اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی نے جو اپنے دور کے انتہائی متعصب شخص تھے، یہ جرأت کی کہ وہ اس شک کو یقین کا درجہ دے دیں اور انہوں نے سید مرتضٰی کے حالات میں لکھ دیا کہ من طالع کتابه نهج البلاغه جزم بانه مكذوب على امير المومنينؑ نفيه السّب الصريح بل حط على السيدين ابى بكر وعمر۔

جوشخص ان کی کتاب نہج البلاغہ کو دیکھے وہ یقین کرسکتا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی طرف اس کی نسبت بالکل جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ اس میں کھلا ہوا سب دشتم اور ہمارے دونوں سرداروں ابوبکر وعمر کی تنقیص ہے۔

اب آپ ذرا اس عجیب رفتار کو دیکھئے کہ تالیف نہج البلاغہ سے دو ڈھائی سو برس بعد یعنی ابن خلکان کے عہد تک تو اختلاف یا شک وشبہ کا بھی نہج البلاغہ کے بارے میں پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بعد ابن خلکان ملک مغرب میں بیٹھ کرعوام الناس کے اختلاف کا اس بارے میں اظہار کرتے ہیں کہ یہ سید مرتضٰی کی جمع کردہ کتاب ہے یا سید رضی کی۔ اور ایک ضعیف قول اس کا بیان کرتے ہیں کہ اس کی نسبت امیر المومنینؑ کی جانب غلط ہے اور پھر واللہ اعلم کہہ کر اس تغلیط کو مشکوک کرتے ہیں۔ یہ اس وقت جبکہ قرب عہد کی وجہ سے پھر بھی ذرائع اطلاع زیادہ ہوسکتے تھے اور اس کے ایک صدی کے بعد ذہنی پہلے تو بیک گردش قلم اس اختلاف کو جو جامع کے بارے میں تھا، ختم کرکے اسے سید مرتضٰی کا کارنامہ قرار دے دیتے ہیں اور پھر اس شک کو یقین کا درجہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ جو بھی نہج البلاغہ کا مطالعہ کرے وہ ایسا ہی یقین کرے گا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے وقت تک تین سو برس میں گویا کسی نے اس کتاب کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا یا انہیں کوئی ایسی عینک ملی ہے جو اس کے پہلے کسی کے پاس نہ تھی اور اب وہ اسی عینک سے اپنے دور کے بعد ہر شخص کو نہج البلاغہ کے مطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں ۔ وہ عینک کیا ہے اسے خود اپنے آخر کلام میں درج کردیتے ہیں ۔علمی حیثیت سے اصول روایت کے لحاظ سے تنقیدی قوانین کے پیش نظر انہیں چاہئے تھا کہ اس کی نسبت غلط ہونے کے ثبوت میں امیر المومنینؑ کا وہ مسلّم کلام پیش کرتے جو سید رضی کے علاوہ دوسرے مستند ماخذوں سے ان کے نزدیک مسلّم ہوتا اور وہ سید رضی کے مندرجہ مضامین سے مختلف ہوتا۔ خود سید رضی کے زمانہ والے مصنفین کے انتقادات کا حوالہ دیتے کہ انہوں نے بھی اسے غلط قرار دیا ہے۔ اس تین سو برس کی مدت میں دوسرے علماء وناقدین نے جو کچھ اس کی ردّو قدح کی ہوتی اسے پیش کرتے مگر ان کے

حبیب و دامن تحقیق میں کوئی ایسی سند موجود نہیں ہے۔ ان کی دلیل اس نسبت کے یقینی طور پر جھوٹ ہونے کی صرف یہ ہے کہ اس میں ان کے سرداروں کی تنقیص ہے۔ کیا علمی دنیا میں اس دلیل کی کوئی قیمت ہوسکتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے ۔ جیسے قرآن نازل ہونے کے چند صدی بعد کوئی طبقہ مشرکین کا قرآن کے کلام الٰہی ہونے سے صرف اس لیے انکار کرے کہ اس میں ان کے الٰہہ کے خلاف تنقیض وندمت کی آیتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کو اپنے جذبات کا تابع بنا کر اگر جانچا جائے ۔ تو کوئی حقیقت باقی ہی نہیں رہ سکتی لواتبع الحق اھوائھم لفسدت السموات والارض۔ اس دروازہ کے کھل جانے کے بعد تمام اصول روایت ودرایت معطل وبیکار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر عقیدہ اور خیال کا انسان پھر ہر قوی سے قوی نص کو صرف اس بناپر رد کردے گا کہ وہ اس کے عقیدہ اور خیال کے خلاف ہے۔ جہاں تک خلفائے ثلاثہ کے مقابل میں شیعوں کے استدلال کا تعلق ہے وہ احادیث رسولؐ یہاں تک کہ صحاح ستہ میں درج شدہ اخبار واحادیث سے بھی اس میں تمسک کرتے ہیں اور نہج البلاغہ کے مندرجات سے کچھ کم وہ احادیث پیغمبرؐ سے فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ محتاط اور علمی اصول کے کسی حد تک پابند علماء اہل سنت کا یہ طریقہ رہا کہ وہ ان احادیث کے مضامین ومطالب کے تاویلوں سے ہمیشہ کام لیتے رہے اور بالکل ان احادیث کے انکار کی جرأت نہیں کی۔ مناظرانہ ضرورتوں سے انکار نصوص کا یہ رجحان جس کا مظاہرہ ذہبی نے کیا ہے یہ بڑھتے بڑھتے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے زمانہ میں یہاں تک آیا کہ شروع شروع عیسائی مبلغین سے مناظرہ میں انہیں وفات مسیحؑ کے خیال کو پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ صرف اس جذبہ کے ماتحت کہ جناب عیسیٰؑ کی یہ ایک طرح کی فضیلت عیسائی پیش کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں، لہذا اس کو ختم کرنا چاہئے ۔ انہوں نے اس مناظرانہ ترکیب کو اصل قرار دیا اور پھر جو اسلامی نصوص اور متفق علیہ احادیث اس بارے میں تھے۔ ان سب کا انکار کردیا اور آخر میں خود ان کے دعوائے مسیحیت کے لئے ایک راستہ بن گیا ۔ یہی جذبہ ترقی کرکے اب اہل قرآن کے ہاتھوں ، جن کی نمایندگی طلوع اسلام وغیرہ کررہے ہیں ، یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ طبری اور دوسرے مفسرین اور مورخین سب کے یہاں کچھ نہ کچھ شیعوں کے موافق باتیں موجود ہیں۔ اس لیے کلیۃً احادیث تفاسیر اور تواریخ کے اعتبار پر انہوں نے ضرب لگادی ہے اور ان سب کے انکار کی یہی بنیاد ہے کہ ان لوگوں نے شیعوں کے موافق چیزیں درج کی ہیں۔ لہذا یہ سب جھوٹ ہے جو عمارت ایک غلط اساس پر قائم کی جاتی ہے ، اس کا آخری انجام یہی ہوتا ہے ۔

کاش ، یہ لوگ حقیقت کو صرف حقیقت کے اعتبار سے دیکھتے اور پھر اپنے جذبات کو اس کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے جو ایک عام مسلمان کا فریضہ ایمانی ہے۔ چہ جائیکہ وہ افراد جو اپنے کو علماء اسلام قرار دیتے ہوں یا دنیا میں اس حقیقت سے متعارف ہوں۔

اس کے بعد کی صدیوں میں یہ دروازہ پاٹوں پاٹ کھل ہی گیا تھا۔ چنانچہ اب تو مناظرہ کے میدان کا یہ بہت ہی عام ہتھیار بن گیا کہ جب نہج البلاغہ کا کوئی کلام پیش ہوتو اسے غلط کہہ دیا جائے۔ اسکے بعد پھر موجودہ دور میں تو اور بھی بہت سے جذبات کا رفرماہوگئے ہیں۔ مثلاً تجدد پسند طبقے کا یہ رجحان کہ عورت ہر بات میں مرد کے برابر ہے، جب نہج البلاغہ کے مندرجات سے مجروح ہوتا ہے تو اس جذبہ کے تحفظ کے لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ حضرت علیؑ کا کلام نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں عورتوں کی تنقیص ہے اور موجودہ سائنس سے اس کے نظریات کو ٹکراتے ہوئے دیکھا جاتا ہے تو سائنس کو اصل قرار دے کر اس کا انکار کردیا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کا کلام ہو ۔کبھی اس جذبہ کے ماتحت کہ اس میں ان علوم وفنون کی حقیقتوں کا اظہار ہے جسے بعد والے اپنے وقت کا کارنامہ سمجھتے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام بعد کی پیداوار ہے۔ اس لیے کہ اس وقت عرب میں یہ علوم وفنون تھے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ کسی ایک لفظ مثلاً سلطان بمعنی بادشاہ کو حادث قرار دے کر اس لفظ کے استعمال کو نہج البلاغہ میں اس کی دلیل بنایا جاتا ہے کہ یہ جناب امیرؑ کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ حالانکہ یہ سب باتیں صرف اپنی خواہشوں کے تکمیل کا ایک بہانہ ہیں اور اپنے مزعومات کو اصل قرار دے کر حقیقتوں کو ان کا تابع بنالینے کا کرشمہ ہے۔قرآن مجید میں درج حقائق کب ایسے ہیں جو اس وقت کے عربوں کو معلوم ہوں اور احادیث رسولؐ کے بہت سے معارف کب اس وقت کی دنیا کو معلوم تھے جو باب مدینۃ العلم کے اقوال میں کچھ ایسے علوم وفنون کے انکشاف پر تعجب کیا جائے ،جن کو اس وقت کی دنیا کو خبر نہ تھی۔ ہر لفظ جس کے لئے کسی قدیم عربی شعر کو سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعر سے پہلے اس کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ ورنہ اس شعر کو ہم سند ہی قرار دینے کی کیوں زحمت محسوس کرتے ،تو کیا اس تصور کو حقیقت قرار دے کر اس کے پہلے یہ لفظ کہیں نہیں ہے ، ہم اس شعر کا انکار کردیں گے یا صحیح طریقہ یہ ہوگا اور یہی اصول معمول بہ ہے کہ اس شعر میں اس لفظ کے وجود سے ہم خود یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لفظ کا زبان عرب میں رواج تھا۔ اسی طرح ہم آخر لفظ سلطان میں یہ اصول کیوں اختیار کرتے ہیں کہ ہم اپنے اس مزعومہ کو وحی منزل

قرار دیں کہ یہ لفظ حادث ہے اور کلام عرب میں موجود نہ تھی۔ خود جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں اس کا وارد ہونا اس کا ثبوت کیوں نہ ہو کہ یہ لفظ چاہے عام اکثریت کی زبان پر جاری نہ ہو، لیکن وہ کلیۃً مفقود نہیں تھی اور اس کا شاید یہی کلام امیر المومنینؑ کیوں قرار نہ پائے۔ پھر السلطان کو لفظی طور پر بمعنی مَلِک قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ وہ بمعنی مصدری یعنی حکومت واقتدار اور غلبہ یقینی موجود تھا اور قرآن مجید میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ذریعہ غلبہ ہونے ہی کی بنا پر دلیل کو سلطان کہا گیا ہے جس طرح اسی اعتبار سے اس کو حجت کہا جاتا ہے اور یہی معنی مصدری بعد میں اسی شکل اختیار کر کے بمعنی ملک ہوگے ہیں تو اس میں کیا دشواری ہے کہ اذاتغیر السلطان تغیر الزمان میں ہم السلطان کو حاکم کے معنی میں نہیں، بلکہ حکومت واقتدار کے معنی میں لیں، جو ہماری زبان میں بھی بمعنی حاکم برابر رائج ہے۔ لفظی طور پر یہ معنی نہ کہیں کہ جب بادشاہ بدلتا ہے تو زمانہ بدل جاتا ہے بلکہ یہ معنی کہیں کہ جب اقتدار بدلتا ہے تو زمانہ میں بھی تغیر ہوجاتا ہے۔ نتیجہ وہی ایک ہے مگر وہ ہمارا مزعومہ بھی اگر ہمیں بہت عزیز ہو تو اس صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ غرض یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں، جو کسی اصول روایت ودرایت پر منطبق نہیں ہوتیں۔ خلفاء کے بارے میں نہج البلاغہ میں ہرگز کوئی ایسی سخت بات نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں موجود نہ ہو اور جناب امیر علیہ السّلام کے ان رجحانات کے مطابق نہ ہو، جو مسلّم الثُّبوت حیثیت سے دوسرے کتب اہلِ سنّت میں بھی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اس قسم کے الفاظ کا حضرت کی زبان پر آنا تو اس کا ثبوت ہے کہ وہ آپ کا کلام ہے۔ ہاں اگر آپ کے واقعی رجحانات کے خلاف اس میں الفاظ ملتے تو اس پر تو غور کرنے کی بھی ضرورت ہوتی کہ وہ کس بنا پر ہیں یا انہیں کسی مجبوری کا نتیجہ قرار دینا پڑتا جیسے بعض علماء کے خیال کے مطابق لله بلاء فلان والا خطبہ یہی نوعیّت رکھتا ہے۔ مگر وہ کلام جو اپنے متکلّم کے خیالات کا نمایاں طور پر آئینہ بردار ہو اسے کسی حیثیت سے اس متکلم کی طرف نسبت صحیح ماننے میں تامّل کا کوئی سبب ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ابنِ خلکان کے اس اظہارِ تذبذب اور ذہبی کے اس جسارت انکار کے پھر بھی منصف مزاج اور حقیقت پسند علماء ومحققین بلاتفریق مذہب وملّت نہج البلاغہ کے مندرجات کو کلامِ امیرالمومنینؑ مانتے رہے اور اس کا اظہار کرتے رہے جن میں سے کچھ افراد کا جو سرِ دست پیشِ نظر ہیں ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- علاّمہ شیخ کمال الدین محمد ابن طلحہ قریشی شافعی متوفّی ۶۵۲ھ اپنی کتاب ''مطالب السؤل فی

مناقب آل الرّسول" میں جو لکھنؤ میں بھی طبع ہو چکی ہے۔ علوم امیر المومنینؑ کے بیان میں لکھتے ہیں:

و رابعها علم البلاغة والفصاحة وكان فيها اماما لا يشق غباره ومقدما لا تلحق اثاره ومن وقف على كلامه المرقوم الموسوم بنهج البلاغة صار الخبر عنده عن فصاحةعيانا والظن بعلو مقامه فيه ايقاناً.

چوتھے علم فصاحت وبلاغت آپ اس میں امام کا درجہ رکھتے تھے جن کے قدم تک بھی پہنچنا ناممکن ہے اور ایسے پیشرو تھے، جن کے نشانِ قدم کا مقابلہ نہیں ہوسکتا اور جو حضرت کے اس کلام پر مطلع ہو جو نہج البلاغہ کے نام سے موجود ہے اس کے لیے آپ کی فصاحت کی سماعی خبر مشاہدہ بن جاتی ہے اور آپ کی بلندی مرتبہ کا اس باب میں گمان یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

النوع الخامس فی الخطب والمواعظ مما نقلته الرواة وردته الثقات عنه عليه السلام قداشتمل كتاب نهج البلاغة المنسوب اليه علىٰ انواع من خطبه ومواعظه الصادعة باوامرها ونواهيها المطلعة انوار الفصاحة والبلاغة مشرقة من الفاظها ومعانيها الجامعة حكم عيون علم المعانى والبيان علىٰ اختلاف اسالبها.

پانچویں قسم ان خطب اور مواعظ کی شکل میں ہے، جس کو راویوں نے بیان کیا ہے اور ثقات نے حضرت سے ان کو نقل کیا ہے اور نہج البلاغہ کتاب جس کی نسبت حضرت کی طرف دی جاتی ہے وہ آپ کے اپنے اوامر ونواہی کو مکمّل طور پر ظاہر کرتے اور فصاحت وبلاغت کے انوار کو اپنے الفاظ و معانی کے اصول اور اسرار کو اپنے مختلف اندازِ بیان میں ہمہ گیر صورت سے ظاہر کرتے ہیں۔

اس میں مندرجات نہج البلاغہ کو معتبر و ثقہ راویوں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یقینی طور پر کلام امیر المومنینؑ تسلیم کیا ہے۔ ایک جگہ جو منسوب کی لفظ ہے۔ اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بحیثیت مجموعی کتاب بشکل کتاب سے متعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کتاب امیر المومنینؑ کی جمع کردہ نہیں ہے۔ کتاب تو حقیقتاً سیّدرضی ہی کی ہے مگر عوام مجازی طور پر یا ناواقفیت کی بنا پر یونہی کہتے ہیں کہ یہ امیر المومنینؑ کی کتاب ہے۔ یہ نسبت اس کلام کے لحاظ سے دی جاتی ہے جو اس کتاب میں درج ہے اور اسی لیے اس محل پر علاّمہ ابنِ طلحہ نے منسوب کی لفظ صرف کی ہے جو بالکل درست ہے اس سے اصل کلام کے بارے میں ان کے وثوق واطمینان کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔

۲- علاّمہ ابوحامدعبدالحمید ابنِ ہبۃ اللہ المعروف بابن ابی الحدید مدائنی بغدادی متوفّٰی ۶۵۵ھ جنہوں نے اس کتاب کی مبسوط شرح لکھی ہے وہ حضرت امیرعلیہ السلام کے فضائلِ ذاتیہ میں فصاحت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

اما الفصاحة فهو امام الفصحاء و سيّد البلغاء و عن كلامه قيل دون كلام الخالق و فوق كلام المخلوقين و منه تعلّم النّاس الخطابة و الكتابة.

آپ کی فصاحت کا یہ عالم ہے کہ آپ فصحاء کے امام اور اہلِ بلاغت کے سرگروہ ہیں،آپ ہی کے کلام کے متعلّق یہ مقولہ ہے کہ وہ خالق کے کلام کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے اور آپ ہی سے دنیا نے خطابت وبلاغت کے فن کو سیکھا۔

اس کے بعدعبدالحمید بن یحییٰ اور ابن نباتہ کے وہ اقوال درج کئے گئے ہیں،جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں پھرلکھا ہے:

و لما قال محقن ابن ابى محقن لمعاوية جئتک من عند اعمي الناس قال له ويحک كيف يكو ن اعمي الناس فو الله ما سنّ الفصاحة لقريش غيره و يكفى هذا الكتاب الذى نحن شارحوه دلالة علىٰ انه لايجارى فى الفصاحة و لايجارى فى البلاغة.

اور جب محقن بن ابی محقن (خوشامدمیں) نے معاویہ سے کہا کہ میں سب سے زیادہ گنگ شخص کے پاس سے آیا ہوں معاویہ نے کہا کہ وائے ہوتم پر وہ گنگ کیونکر کہے جاسکتے ہیں حالانکہ خدا کی قسم فصاحت کا راستہ قریش کوسوا ان کے کسی اور نے نہیں دکھایا ہے اور یہی کتاب جس کی ہم شرح لکھ رہے ہیں اس امرکو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ حضرت فصاحت میں وہ بلند درجہ رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا اور بلاغت میں آپ کا مقابلہ نہیں کیاجاسکتا۔

علاّمہ مذکور دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں:

ان كثيرا من فصوله داخل فى باب المعجزات المحمدية لاشتمالها على الاخبار الغيبية وخروجها من وسع الطبيعة البشريه.

اس کتاب کے اکثر مقامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ کہے جاسکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ غیبی خبروں پر مشتمل ہیں اور انسانی طاقت کے حدود سے باہر ہیں۔

حالانکہ علاّمہ ابن ابی الحدید اپنے معتقدات میں جو شیعیت کے خلاف ہیں پورے راسخ ہیں اور

اس لیے نہج البلاغہ میں جہاں جہاں ان کے معتقدات کے خلاف چیزیں ہیں ان کو کافی زحمت درپیش ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی وہ اس شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتے کہ یہ شاید امیرالمومنینؑ کا کلام نہ ہو۔ بلکہ خطبہ شقشقیہ تک جو سب سے زیادہ ان کے جذبات کے خلاف مضامین پر مشتمل ہے وہ اس امر کو بقوت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ علی بن ابی طالب علیہ السّلام کا کلام ضرور ہے اور وہ اس کے خلاف ہر تصوّر کو دلائل کے ساتھ رد کردیتے ہیں، انہوں نے خطبہ ہی میں قدم المفضول علی الفاضل خدا نے (معاذاللہ) کسی مصلحت سے غیر افضل کو افضل پر مقدّم کردیا اور اسی طرح خطبہ شقشقیہ وغیرہ کے تشریحات میں انہوں نے اپنے معتقدات کا اظہار کردیا ہے اور امیرالمومنینؑ کے الفاظ کو معاذاللہ آپ کے بشری جذبات کا تقاضہ قرار دیا ہے۔ یہ امور اس تصور کو ختم کردیتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں اس شیعہ رئیس کی خوشامد مدِّ نظر رکھی ہے جس کے نام پر انہوں نے یہ شرح معنون کی تھی۔ ابن العلقمی شیعہ ضرور تھے، مگر وہ سلطنت بنی عبّاس کے وزیر تھے اور یہ کتاب دولتِ عبّاسیہ کے سقوط سے پہلے ان کے دور وزارت میں لکھی گئی ہے۔ اوّل تو اگر خوشامد مدِّ نظر ہوتی تو وزیر کے بجائے خود خلیفۂ وقت کے جذبات کا لحاظ کرنا زیادہ ضروری ہوتا۔ دوسرے ظاہر ہے کہ سلطنتِ عباسیہ کے وزیر ہونے کے بناپر خود ابنِ العلقمی بھی کھل کر ایسے شخص کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتے تھے جو حکومتِ وقت کے مذہب کے موافق کوئی بات کہے نہ وہ خود ہی ایسے جذبات کا اعلانیہ اظہار کرتے تھے۔ پھر اگر ان کی خوشامد ہی پیش نظر ہوتی تو ابنِ ابی الحدید اسی کتاب میں شیعیت کا رد کیوں کرتے اور خلافت ثلاثہ کو شروع سے لے کر آخر تک بقدرِ امکان مضبوط کرنے کی کوشش کس لیے کرتے۔ ان کا یہ طرزِ عمل صاف بتارہا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں اپنے حقیقی خیالات اور جذبات کو برابر پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ اگر نہج البلاغہ کی صحت میں ذرا سا شک و شبہ کا بھی اظہار کردیتے تو وہ اس سے زیادہ ابن العلقمی کے لیے تکلیف دہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جتنا خدا کی طرف اس غلط کلام کو منسوب کرنا کہ وہ مفضول کو فاضل پر ترجیح دے دیتا ہے یا امیرالمومنینؑ کے اقوال کو معاذاللہ نفسانیت پر محمول کرنا جو خطبہ شقشقیہ وغیرہ کے شروع میں انہوں نے لکھ ڈالا ہے بلکہ ایک شیعہ کے لیے ان الفاظ کے کلام امیرالمومنینؑ ہونے سے انکار کردینا اتنا صدمہ نہیں پہنچاسکتا اور حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ کی اتنی بڑی توہین نہیں ہے جتنا یہ تصور کرنا کہ حضرت نے معاذاللہ حقیقت کے خلاف صرف اپنی ذاتی رنجش کی بناپر یہ الفاظ فرمادیئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہرگز ابنِ ابی الحدید کو ابن العلقمی کی کوئی

خاطر داری اظہارِ خیالات میں پیشِ نظر نہ تھی اور اس کتاب پر ابن العلقمی نے اگر کوئی انعام دیا ہو تو یہ صرف ان کے وسعتِ صدر اور وسعتِ نظر اور تحمّل کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ایک مخالفِ مذہب کے ایک علمی کارنامے کی صرف علمی کارنامہ ہونے کی بنا پر قدر کی جو کہ ان کے خود عقائد و خیالات سے متضاد مضامین پر بھی مشتمل تھا۔

۳- ابوالسعادات مبارکہ مجدالدّین ابنِ اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے اپنی مشہور کتاب ''نہایہ'' میں جو احادیث وآثار کے لغات کی شرح کے موضوع پر ہے۔ کثیر التعداد مقامات پر نہج البلاغہ کے الفاظ کو حل کیا ہے۔ ابنِ کثیر کی حیثیت فقط ایک عام لغوی کی نہیں ہے بلکہ وہ محدّث بھی ہیں۔ اگر صرف ادبی اہمیت کے لحاظ سے ان کو ان الفاظ کا حل کرنا ہی ضروری تھا تو وہ اس کو نہج البلاغہ کا نام لکھ کر درج کرتے پھر واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اس کو وہ کلامِ امیرالمومنینؑ سمجھتے ہی نہ، تو انہیں اس کتاب میں جو صرف احادیث اور آثار کے حل کے لیے لکھی گئی ہے ان لغات کو جگہ ہی نہ دینا چاہیے تھی کیوں کہ اصطلاحی طور پر اثر صرف صحابہ اور ممتاز تابعین کی زبان سے نکلے ہوئے اقوال کو کہتے ہیں۔ کسی متاخر عالم کی کتاب کے الفاظ نہ حدیث میں داخل ہیں اور نہ اثر میں۔ ان کا ان الفاظ کو جگہ دینا ہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ اس کو سیّد رضی کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ کلامِ امیرالمومنینؑ قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان لغات کو درج کرنے میں ہر مقام پر تصریحاً وہ حدیثِ علیؑ لفظ کا استعمال کرتے ہیں، جیسے لغت جوئ میں منه حدیث علیؑ یونہی فتق الاجواء وشق الارجاء میں زیادہ تر ان الفاظ کا تذکرہ حدیث علیؑ کی لفظوں کے ساتھ ہے اور کہیں پر خطبہ علیؑ ہے، جیسے لغت لوط میں فی خطبة علیؑ ولاطها بالبلة حتی لزبت ایک جگہ لغت ایم میں یہ الفاظ ہیں:کلام علی مات قیّها و طال تایّمها. اسی طرح لغت اسل میں فی کلام علیؑ کے الفاظ ہیں اور ایسے ہی دو ایک جگہ اور باقی تمام مقامات پر حدیث علیؑ لکھا ہے اور جو مکاتیب کے الفاظ ہیں، انہیں کتاب علیؑ کہہ کر درج کیا ہے۔ ان تمام مقامات کو استقاء کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب ''نہج البلاغۃ کے استناد'' میں درج کیا ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۴- علاّمہ علاء الدّین قوشجی متوفّی ۸۷۵ھ ''شرح تجرید'' میں قولِ محقق طوسی'' افصحهم لسانا'' کی شرح میں لکھتے ہیں علی مایشهد به کتاب نهج البلاغة و قال البلغاء ان کلامه دون کلام الخالق و فوق کلام المخلوق جس کی شاہد ہے۔ آپ کی کتاب نہج البلاغہ اور اہلِ بلاغت کا

قول ہے کہ آپ کا کلام خالق کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے۔

۵- محمد بن علی بن طباطبائی معروف بہ ابن طقطقی اپنی کتاب ''تاریخ الفخری فی آداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ'' مطبوعہ مصر۹ میں لکھتے ہیں:

عدل ناس الی نهج البلاغة من كلام اميرالمومنين على ابن ابى طالبؑ فانّه الكتاب الّذى يتعلّم منه الحكم و المواعظ و الخطب و التوحيد و الشجاعة و الزهد وعلوّ الهمّة و ادنىٰ فوائده الفصاحة و البلاغة.

حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام کا کلام ہے۔ کیوں کہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس سے حکم اور مواعظ اور توحید اور زہد اور علوہمّت ،ان تمام باتوں کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اور اس کا سب سے ادنیٰ فیض فصاحت وبلاغت ہے۔

۶- علاّمہ محدّث ملاّ طاہر فتنی گجراتی، انہوں نے بھی'' مجمع الانوار'' ''نہایہ'' کی طرح احادیث وآثار کے لغات ہی کی شرح میں لکھی ہے اور انہوں نے بھی الفاظ نہج البلاغہ کو کلامِ امیرالمومنینؑ تسلیم کرتے ہوئے ان کی شرح کی ہے۔

۷- علاّمہ احمد بن منصور کازردنی اپنی کتاب مفتاح الفتوح میں امیرالمومنینؑ کے حالات میں لکھتے ہیں:

و من تامل فى كلامه و كتبه و خطبه ورسالاته علم ان علمه لايوازى علم احد و فضائله لاتشاكل فضائل احدبعد محمدصلى اللّٰه عليه وسلّم ومن جملتها كتاب نهج البلاغه.

جو حضرت کے کلام اور خطوط اور خطبوں اور تحریروں پر غور کی نگاہ ڈالے اسے معلوم ہوگا کہ حضرت کا علم کسی دوسرے کے علم کی طرح اور حضرت کے فضائل پیغمبرؐ کے بعد کسی دوسرے کے فضائل کے قبیل سے نہیں تھے۔ (یعنی بدر جہاز یادہ تھے) اور انہیں میں سے کتاب نہج البلاغہ ہے (اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنّف کے پیشِ نظر یہ حقیقت تھی کہ حضرت کے کلام کا ذخیرہ نہج البلاغہ کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ موجود ہے اور یہ صرف اس کا ایک جز ہے۔

و ايم اللّٰه لقد وقف دونه فصاحة الفصحأ و بلاغة البلغاء و حكمة الحكماء۔

اور خدا کی قسم آپ کی فصاحت کے سامنے تمام فصحاء کی فصاحت اور بلیغوں کی بلاغت اور حکماء روزگار کی حکمت مفلوج ومعطل ہوکر رہ جاتی ہے۔

۸- علاّمہ یعقوب لاہوری ''شرح تہذیب الکلام'' میں افصح کی شرح میں لکھتے ہیں:

و من ازاد مشاهدة بلاغة ومسامعة فصاحتهٖ فلينظرالى نهج البلاغة ولاينبغى ان يتسب هذا الكلام البليغ الى رجل شيعى.

جوشخص آپ کی فصاحت کو دیکھنا اور آپ کی بلاغت کوسننا چاہتاہووہ نہج البلاغہ پرنظرکرے اور ایسے فصیح وبلیغ کلام کوکسی شیعہ عالم کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔

۹- علاّمہ شیخ احمدابن مصطفیٰ معروف بہ طاشکیری زادہ اپنی کتاب ''شقائق نعمانيه فى علماء دولة عثمانيه'' قاضی قوام الدین یوسف کی تصانیف کی فہرست میں لکھتے ہیں۔ و شرح نهج البلاغة للامام الهمام على بن ابى طالب كرم الله تعالىٰ وجهه

۱۰- مفتی دیارِمصریہ علاّمہ شیخ محمدعبدہ متوفّی ۱۳۲۳ھ جن کی اس سعی جمیل کے مشکور ہونے سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مصراور بیروت وغیرہ اہلِ سنّت کے علمی مرکزوں کو نہج البلاغہ کے فیوض سے بہرہ مند بنانے کا سامان کیا اور وہاں کے باشندوں کو ان کے سبب سے اس جلیل القدر کتاب کا تعارف ہوسکا۔ انہوں نے نہج البلاغہ کو اپنی تفسیر حواشی کے ساتھ مصرمیں چھپوایا۔ جس کے بہت سے ایڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں وہ اپنے اس مقدّمہ میں جو شروع کتابت میں درج کیاہے، اپنی اس وہشت وحیرت کا اظہار کرتے ہوئے جو نہج البلاغہ کے حقائق آگین عبارات سے ان پرطاری ہوئی ہے، تحریر کرتے ہیں: كان يخيل الى فى كل مقام ان حروباشبت وغارات شنت وان للبلاغة دولة وللفصاحة صولة وان الاوهام عرامة وللريب دعارة و ان جحافل الخطابة وكتائب الذرابة فى عقود النظام وصفوف الانتظام تنافح بالصفيح الابلج والقويم الاملج وتمثلج المهج بروائع الحجج فتفل من دعارة الوسادس وتصيب مقاتل الخوانس فما انا الاوالحق منتصر والباطل۔

''ہر مقام پر(اس کے اثنائے مطالعہ میں) مجھے ایسا تصورہوجاتا تھاکہ جیسے لڑائیاں چھڑی ہوئی ہیں۔ بنرد آزمائیاں ہورہی ہیں۔ بلاغت کا زور ہے اور فصاحت پوری قوّت سے حملہ آورہے۔ توہمات شکست کھارہے ہیں۔شکوک وشبہات پیچھے ہٹ رہے ہیں۔خطابت کےلشکرصف بستہ ہیں۔ طلاقتِ لسان کی فوجیں شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں مصروف ہیں، وسوسوں کا خون بہایا جارہاہے اور توہمّات کی لاشیں گررہی ہیں اور ایک دفعہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس حق غالب آ گیا اور باطل کی شکست ہوگئی اور فتح ونصرت کا سہرا اس کےعلمبردار اسداللہ الغالب علی ابنِ ابی طالبؑ کے سرہے۔

بلکہ اس کتاب کے مطالعہ میں جتنا جتنا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا۔ میں نے مناظرہ کی تبدیلی اور مواقف کے تغیّر کو محسوس کیا۔ کبھی میں اپنے کو ایسے عالم میں پاتا تھا جہاں معانی کی بلند روحیں خوشنما عبارتوں کا جامہ پہنے ہوئے پاکیزہ نفوس کے گرد چکّر لگاتی اور صاف دلوں کے نزدیک آ کر انہیں سیدھے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتی اور نفسیاتی خواہشوں کا قلع قمع کرتی اور لغزش مقامات سے متنفّر بنا کر فضیلت و کمال کے راستوں کا سالک بناتی ہیں اور کبھی ایسے جملے سامنے آ جاتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ تیوریاں چڑھائے ہوئے اور دانت نکالے ہوئے ہولناک شکلوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اور ایسی روحیں ہیں جو چیتوں کے پیکروں میں اور شکاری پرندوں کے پنجوں کے ساتھ حملہ پر آمادہ ہیں اور ایک دم شکار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دلوں کو ان کے ہوا و ہوس کے مرکزوں سے جھپٹ کر لے جاتے ہیں اور ضمیروں کو پست جذبات سے زبردستی علیٰحدہ اور غلط خواہشوں اور باطل عقیدوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات میں میں یہ مشاہدہ کرتا تھا کہ ایک نورانی عقل، جو جسمانی مخلوق سے کسی حیثیت سے بھی مشابہ نہیں ہے، خداوندی بارگاہ سے الگ ہوئی اور انسانی روح سے متصل ہوکر اسے طبیعت کے پردوں سے اور مادیّت کے حجابوں سے نکال لیا اور اسے عالمِ ملکوت تک پہنچا دیا اور تجلیّات ربّانی کے مرکز تک بلند کر دیا اور لے جا کر عالمِ قدس میں اس کو ساکن بنا دیا اور بعض لمحات میں معلوم ہوتا تھا کہ حکمت کا خطیب صاحبانِ اقتدار اور قوم کے اہلِ حل وعقد کو للکار رہا ہے اور انہیں صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دے رہا ہے اور ان کی غلطیوں پر متنبہ کر رہا ہے اور انہیں سیاست کی باریکیاں اور تدبّر وحکمت کے دقیق نکتے سمجھا رہا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو حکومت کے منصب اور تدبّر وسیاست کی اہلیت پیدا کر کے مکمّل بنا رہا ہے۔''

اس میں علاّمہ محمد عبدہ نے جس طرح یقینی طور پر اس کو کلامِ امیرالمومنینؑ تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح اس کے مضامین کی حقانیت اور اس کے مندرجات کی سچائی کا بھی اعتراف کیا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب کے مضامین حق کی فتح اور باطل کی شکست اور شکوک و اوہام کی فنا اور توہّمات و وساوس کی بیخ کنی کا سبب ہیں اور وہ شروع سے آخر تک انسانی روح کے لیے روحانیت و طہارت اور جلال و کمال کی تعلیمات کے حامل ہیں۔

علاّمہ محمد عبدہ کو نہج البلاغہ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے قرآن مجید کے بعد ہر کتاب کے مقابلہ میں ترجیح کا مستحق سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنا یہ اعتقاد بتایا ہے کہ جامعۂ اسلامیہ میں اس کتاب کی

زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ امیرالمومنینؑ ایسے بلند مرتبہ مُصلح عالم کا کلام ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"لیس فی اهل هذه اللغة الا قائل بان کلام الامام علی بن ابی طالبؑ هو اشرف الکلام وابلغه. بعد کلام الله تعالیٰ و کلام نبیّه و اغزره مادة و ارفعه اسلوبا و اجمعه لجلائل المعانی فاجدر بالطالبین لنفائس اللغة و الطامعین فی التدرج لمراقیها ان یجعلوا هذا الکتاب اهم محفوظهم و افضل مأثورهم مع تفهم معانیة فی الاغراض التی جائت لاجلها و تامل الفاظه فی المعانی التی صیغت للدلالة علیها لیصیبوا بذلک افضل غایة و ینتهوا الیٰ خیر نهایة. "

''یعنی اس عربی زبان والوں میں کوئی ایسا نہیں جو اس کا قائل نہ ہوکہ امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام کا کلام کلامِ خداوکلامِ رسول کے بعد ہرکلام سے بلندتر،زیادہ پرمعانی اور زیادہ فوائد کا حامل ہے لہٰذا زبانِ عربی کے نفیس ذخیروں کے طلاّب کے لیے یہ کتاب سب سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے اپنے محفوظات اورمنقولات میں اہم درجہ پررکھیں اور اس کے ساتھ ان معانی ومقاصد کے سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کتاب کے الفاظ میں مضمر ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ علاّمہ محمدعبدہ کی یہ کوشش پورے طور پر بارآور بھی ہوئی۔ ایسے تنگ نظری کے ماحول میں جب کہ علمی دنیا کا یہ افسوسناک رویّہ ہے کہ خود اہلِ سنت کی وہ کتابیں جو اہلِ بیت معصومین سے یاحضرت علی ابنِ ابی طالبؑ سے متعلّق ہیں۔ انہیں زیادہ تر ایران کے شیعی مطبعوں نے شائع کیا ہے۔مگرمصر، بیروت وغیرہ کے علمی مرکزوں نے انہیں کبھی قابلِ اشاعت نہ سمجھا۔ مثلاً سبط ابن جوزی کتب سیر میں پوری علمی جلالت سے یادکئے گئے ہیں مگران کی کتاب تذکرہ صرف اس لیے سوادِ اعظم کی بارگاہ میں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی گئی کہ اس میں اہلِ بیت رسولؐ کے حالات زیادہ ہیں اسی طرح حافظ نسائی کی ''خصائص'' وغیرہ مگرنہج البلاغہ اپنے تمام مندرجات کے باوجودجن سے سوادِ اعظم کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ پھربھی مصراور بیروت کے علمی حلقوں میں پوری پوری مقبولیت اور مرکزیّت رکھتی ہے۔ اس کے مسلسل ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مدارس اور یونیورسٹیوں کے نصابوں میں داخل ہے۔ یہ صرف ہندوستان یا پاکستان کی مناظرانہ ذہنیت اور اس کی مسموم فضاہے کہ یہاں کے مدارس میں اکثر اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتاہے جو خالص شیعی کتاب سے ہونا چاہیئے۔علاّمہ شیخ محمدعبدہ نے

نہ صرف اس کتاب پر حواشی لکھ دیئے اور اسے طبع کردیا بلکہ وہ اپنی گفتگوؤں میں برابر اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مجلّہ ''الہلال'' مصر نے اپنی جلدنمبر ۳۵ کے شمارۂ اوّل بابت نومبر ۱۹۲۶ھ کے صفحہ ۸۷ پر چار سوالات علمی طبقہ کی توجہ کے لیے شائع کئے تھے۔ جن میں پہلا سوال یہ تھا کہ:

ما هو الكتاب او الكتب التى طالعتموها فى شبابكم فافادتكم و كان لها اثرفى حياتكم.

یعنی وہ کونسی کتاب یا کتابیں ہیں جن کا آپ نے دورِ شباب میں مطالعہ کیا توانہوں نے آپ کو فائدہ پہنچایا اور ان کا آپ کی زندگی پر اثر پڑا۔

اس سوال کا جواب جو استاد شیخ مصطفٰے عبدالرزّاق نے دیا ہے، وہ شمارۂ دوم بابت دسمبر ۱۹۲۶ھ کے صفحہ ۱۵۰ پر شائع ہوا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

طالعت بارشاد الاستاذ المرحوم الشيخ محمدعبده ديوان الحماسة و نهج البلاغة.

میں نے استاد مرحوم شیخ محمدعبدہ کی ہدایت سے دیوان حماسہ اور نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا۔

عبدالسمیع انطا کی نے بھی جن کی رائے اس کے بعد آئے گی، اس کا ذکر کیا ہے کہ علاّمہ محمدعبدہ نے مجھ سے فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ انشاء پردازی کا درجہ حاصل کرلو، تو امیرالمومنین حضرت علیؑ کو اپنا استاد بناؤ اور ان کے کلام کو اپنے لیے چراغ قرار دو۔

موصوف کا یہ عقیدہ نہج البلاغہ کے متعلّق کہ وہ تمام وکمال کا کلام ہے، اتنا نمایاں تھا کہ ان کے تمام شاگرد جو ان کے بعد سے اب تک مصر کے بلند پایہ اساتذہ میں رہے، اس حقیقت سے واقف تھے۔ چنانچہ استاد محمد محی الدین عبدالحمید مدرس کلیۃ نعتِ عربیہ، جامعہ ازہر جن کے خیالات خود ان کی عبارت میں اس کے بعد پیش ہوں گے۔ وہ اپنے شائع کردہ ایڈیشن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"عسيت ان تسأل رأى الاستاذ الامام الشيخ محمدعبده فى ذلك وهوالذى بعث الكتاب من مرقده و لم يكن احد اوسع منه اطلاعاً و لا ادق تفكير او الجواب علىٰ هذا تساؤل انا نعتقد انه رحمه اللّٰه كان مقتنعاً بان الكتاب كله للامام على رحمه اللّٰه۔ "

یعنی ممکن ہے تم اس بارے میں استاد امام شیخ محمدعبدہ کی رائے دریافت کرنا چاہتے ہو جنہوں نے اس کتاب کو خوابِ گمنامی سے بیدار کیا اور ان سے بڑھ کر کوئی وسعتِ اطلاع اور باریکی نگاہ میں مانا بھی نہیں جاسکتا تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو تمام وکمال امیرالمومنینؑ کا کلام سمجھتے تھے۔

علاّمہ محمد عبدہ کا یہ مقدّمہ جس کے اقتباسات ہم نے درج کئے ہیں، خود دنیائے ادبیت میں کافی اہمیّت رکھتا ہے۔ چنانچہ سیّد احمد ہاشمی نے اپنی کتاب ''جواہرالادب'' حصہ اوّل میں صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸ پر اسے تمام و کمال درج کردیا ہے اور اس پر عنوان قائم کیا ہے وصف نہج البلاغۃ للامام المرحوم الشیخ محمد عبدہ المتوفی ۱۳۲۲ھ۔

۱۱- ملک عرب کے مشہور مصنّف، خطیب اور انشاء پرداز شیخ مصطفیٰ غلائینی استاذ التفسیر و الفقہ و الادب العربیہ فی الکلیۃ الاسلامیہ، بیروت، اپنی کتاب ''اریج الزھر'' میں زیرِ عنوان نھج البلاغۃ واسالیب الکلام العربی ایک مبسوط مقالہ کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:

"من احسن ماینبغی مطالعته لمن یتطلب الاسلوب العالی کتاب نهج البلاغة للامام علی رضی اللّٰه عنه و هوالکتاب الذی انشأت هذا المقال لاجله فان فیه من بلیغ الکلام و الاسالیب المدهشة وَ المعانی الرائقة و مناحی الموضوعات الجلیلة مایجعل مطالعه اذا زاوله مزاولة صحیحة بلیغا فی کتابته و خطابته و معانیه."

یعنی بہترین چیز جس کا مطالعہ بلندمعیار ادب کے طلب گاروں کو لازم ہے وہ امیرالمومنین علی علیہ السّلام کی کتاب نہج البلاغہ ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے لیے خاص طور پر یہ مقدّمہ لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں بلیغ کلام اور ششدر کردینے والے طرزِ بیان اور خوش نما مضامین اور مختلف عظیم الشان مطالب اپنی انشاپردازی اپنی خطابت اور اپنی گفتگو میں بلاغت کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے کثیرالتعداد افراد بلکہ اقوام نے استفادہ کیا ہے جن میں سے ایک کاتب الحروف بھی ہے۔ میں ان تمام افراد کو جو عربی کے بلند اسلوبِ تحریر کے طالب اور کلامِ بلیغ کے جویا ہوں۔ اس کتاب کے حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۲- استاذ محمد کرد علی رئیس مجمع علمی دمشق نے ''الہلال'' کے چار سوالات کے جواب میں جن میں سے تیسرا سوال یہ تھا کہ ماهی الکتب التی تنصحون الشبان الیوم بقرأتها. وہ کونسی کتابیں ہیں جن کے پڑھنے کی موجودہ زمانہ کے نوجوانوں کو آپ ہدایت کرتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

"اذا طلب البلاغة فی اتم مظاهرها و الفصاحة التی لم تشبهها عجمة فعلیک بنهج البلاغة دیوان خطب امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ و رسائله الیٰ عماله یرجع الیٰ فصل

الانشاء والمنشئین فی کتابی" "القدیم والحدیث" طبع بمصر ۱۹۵۰ ء

اگر بلاغت کا اس کے مکمل ترین مظاہرات کے ساتھ مشاہدہ مطلوب ہو اور اس فصاحت کو جس میں ذرّہ برابر بھی زبان کی کوتاہی شامل نہیں ہے۔ دیکھنا ہو تو تم کو نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، جو امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے خطب ومکاتیب کا مجموعہ ہے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "القدیم الحدیث"۔ مطبوعہ مصر ۱۹۲۵ء فصل الانشاء والمنشؤن دیکھنا چاہئے۔

یہ جواب "الہلال" کی جلد نمبر ۳۵ کے شمارہ نمبر ۵ بابت ماہ مارچ ۱۹۲۷ء میں صفحہ ۵۷۲ پر شائع ہوا ہے۔

۱۳- استاد محمد محی الدین المدرس فی کلیۃ العربیۃ بالجامع الازہر جنہوں نے نہج البلاغہ پر تعلیقات تحریر کئے ہیں اور علاّمہ شیخ محمد عبدہ کے حواشی برقرار رکھتے ہوئے بہت سے تحقیقات و شرح کا اضافہ کیا ہے اور ان حواشی کے ساتھ یہ کتاب مطبع استقامۃ مصر میں طبع ہوئی ہے۔ انہوں نے اس اڈیشن کے شروع میں اپنی جانب سے ایک مقدّمہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں نہج البلاغہ کے استناد و اعتبار پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ضروری اجزاء یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

" و بعد فھٰذا کتاب نھج البلاغۃ و ھو ما اختارہ الشریف الرضی ابوالحسن محمّد بن الحسن الموسوی من کلام امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ الذی جمع بین دفتیہ عیون البلاغۃ و فنونھا و تھیائت بہ للناظر فیہ اسباب الفصاحۃ و دنا منہ قطانھا اذ کان من کلام افصح الخلق بعد الرسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم منطبقا و اشدھم اقتدار او ابرعھم حجۃ و املکھم لغۃ یدیرھا کیف شاء الحکیم الذی تصدر الحکمۃ عن بیانہ و الخطیب الذی یملاء القلب سحرلسانہ العالم الذی تھیّا لہ من خلاط الرّسول و کتابۃ الوحی و الکفاح عن الدین بسیفہ و لسانہ منذ حداثتہ ما لم یتھیّا لاحد سواہ ھذا کتاب نھج البلاغۃ و انا بہ حفی منذ طرائۃ السن و میعۃ الشباب فلقد کنت اجد والدی کثیر القرأۃ فیہ و کنت اجد عمی الاکبر یقضی معہ طویل الساعات یردد عباراتہ و یستخرج معانیھا و یتقبل اساویہ و کان لھما من عظیم التاثیر علیٰ نفسی ماجعلنی اتفوا اثرھما فاحلہ من قلبی المحلّ الاوّل و اجعلہ سمیری الذی لا یمل و انیسی الذی اخلوا الیہ اذا عزّ الانیس. "

یہ کتاب نہج البلاغہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام کے کلام کا وہ انتخاب ہے جو شریف

رضی ابوالحسن محمد بن حسن موسوی نے کیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے، جو اپنے دامن میں بلاغت کے نمایاں جوہر اور فصاحت کے بہترین مُرقعے رکھتی ہے اور ایسا ہونا ہی چاہیئے۔ کیوں کہ وہ ایسے شخص کا کلام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد تمام خلق میں سب سے زیادہ فصیح البیان سب سے زیادہ قدرتِ کلام کا مالک اور قوتِ استدلال میں زیادہ اور الفاظِ لغت عربی پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والا تھا۔ کہ جس صورت سے چاہتا تھا انہیں گردش دے دیتا تھا اور وہ بلند مرتبہ حکیم جس کے بیان سے حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور وہ خطیب جس کی جادو بیانی دلوں کو بھر دیتی ہے۔ وہ عالم جس کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خدا کے ساتھ انتہائی روابط اور وحی کی کتابت اور دین کی نصرت میں شمشیر و زبان دونوں سے جہاد کے ابتدائی عمر سے وہ مواقع حاصل ہوئے جو کسی دوسرے کو ان کے سوا حاصل نہیں ہوئے۔ یہ ہے کتاب نہج البلاغہ، اور میں اپنے عنفوانِ شباب اور ابتدائے عمر ہی سے اس کا گرویدہ رہا ہوں، کیوں کہ میں اپنے والد کو دیکھتا تھا کہ وہ اکثر اس کتاب کو پڑھتے تھے اور اپنے بڑے چچا کو بھی دیکھتا تھا کہ وہ گھنٹوں پڑھتے رہتے اس کے معانی کو سمجھتے رہتے اور اس کے اندازِ بیان پر غور کرتے رہتے اور ان دونوں بزرگواروں کا میرے دل پر اتنا بڑا اثر تھا، جس نے مجھے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مجبور قرار دیا جو ہمیشہ میرے لیے دلبستگی کا باعث ہے۔

اس کے بعد علامۂ مذکور نے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسے خود شریف رضیؒ کا کلام قرار دیتے ہیں ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں کہ سب سے اہم اسباب جو اس کتاب کے کلامِ امیرالمومنینؑ نہ ہونے سے متعلق پیش کئے جاتے ہیں، صرف چار ہیں۔ پہلے یہ کہ اس میں اصحابِ رسول کی نسبت ایسے تعریضات ہیں جن کا حضرت علی علیہ السّلام سے صادر ہونا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً معاویہ، طلحہ، زبیر، عمرو بن عاص اور ان کے اتباع کے بارے میں سب وشتم تک موجود ہے۔ دوسرے اس میں لفظی آرائش اور عبارات میں صنعت گری اس حد تک ہے جو حضرت علی علیہ السّلام کے زمانے میں مفقود تھی۔ تیسرے اس میں تشبیہات واستعارات اور واقعات و مناظر کی صورت کشی اتنی مکمل ہے جس کا پتہ صدرِ اسلام میں اور کہیں نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ کی اصطلاحیں اور مسائل کے بیان میں اعداد کا پیش کرنا، یہ باتیں اس زمانہ میں رائج نہ تھیں۔ چوتھے اس کتاب کی اکثر عبارتوں سے علمِ غیب کے ادّعا کا پتہ چلتا ہے، جو حضرت علیؑ ایسے پاکباز انسان کی شان سے بعید ہے۔

موصوف ان خیالات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خدا گواہ ہے کہ ہمیں ان اسباب میں سے کسی ایک میں اور ان سب میں مجموعی طور پر بھی کوئی واقعی دلیل، بلکہ دلیل نما شکل بھی اس دعوے کے ثبوت میں نظر نہیں آتی جو ان لوگوں کا مدّعا ہے بلکہ انہیں تو ایسے شکوک وشبہات کا درجہ بھی نہیں دیا جاسکتا جو کسی حقیقت کے ماننے میں تھوڑا سا دغدغہ بھی پیدا کرسکتے ہوں اور جن کے رفع کرنے کی ضرورت ہو۔ پھر انہوں نے ایک ایک کرکے ہر بات کو رد بھی کیا ہے۔ پہلی بات کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد مسئلہ خلافت میں طرزِ عمل ہی ایسا اختیار کیا گیا جس سے فطرتاً حضرت علی علیہ السّلام کو شکایت ہونا ہی چاہیئے تھی اور آپ کی خلافت کے دور میں اہلِ شام نے آپ کے خلاف جو بغاوت کی، اس سے آپ کو تکلیف ہونا ہی چاہیے۔ ہر دور کے متعلق آپ کے جس طرح کے الفاظ ہیں وہ بالکل تاریخی حالات کے مطابق ہیں۔ اس لیے اس میں شک وشبہ کا کیا محل ہے۔

دوسری اور تیسری دلیل کا یہ جواب ہے کہ حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ کا سا مرتبہ فصاحت اور حکمت دونوں میں کسی اور شخص کو حاصل نہیں تھا، تو پھر آپ کے کلام کی خصوصیتیں اس دور میں کسی اور کے یہاں مل ہی کیونکر سکتی ہیں۔ رہ گیا سجع و قافیہ کا التزام، وہ آپ کے یہاں اس طرح نہیں جس سے آورد ظاہر ہو یا معانی پر اس کا اثر پڑے اور اس حد تک قافیہ وغیرہ کا التزام اس دور میں عموماً رائج تھا۔

چوتھی دلیل کے جواب میں علاّمۂ مذکور نے جو کہا ہے، وہ ہمارے مذہبی عقائد کے بے شک مطابق نہیں ہے، مگر وہ خود ان کے نقطۂ نظر کا حامل ہے، وہ کہتے ہیں کہ جسے علم غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے اسے ہم فراست اور زمانہ کی نبض شناسی کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو حضرت علیؑ ایسے حکیم انسان سے بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا، یہ جواب انہوں نے مادی ذہنیت کے مطابق دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کے دیئے ہوئے علم غیب کا مظاہرہ باعثِ انکار قرار دیا جائے، تو اکثر احادیثِ نبویہ بھی اس زد میں آجائیں گی اور خدا کی طرف سے علمِ غیب کا مظاہرہ تو اکثر قرآن کی آیات سے نمودار ہی ہے۔ پھر قرآن کی آیتوں کا بھی انکار کرنا چاہیے اور اگر علم الٰہی کی بنا پر ان آیات کو تسلیم کیا جائے تو اس کے عطا کردہ علم سے علیؑ جیسے عالم ربّانی کے کلام میں اس طرح کی باتوں کے تذکرہ پر بھی کسی حرف گیری کا موقع نہیں ہے۔

۱۴- استاد شیخ محمد حسن نائل المرصفی نے بھی نہج البلاغہ کی ایک شرح لکھی ہے، جو دارالکتب العربیہ

سے شائع ہوئی ہے:اس کے مقدّمہ میں **کلمة فی اللغة العربیه** کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

ولقد کان المجلّی فی هذه الحلیله علیٰ صلوات اللّٰه علیه و ما حسبنی احتاج فی اثبات هذا الیٰ دلیل اکثر من نهج البلاغة ذٰلک الکتاب الذی اقامه اللّٰه حجة واضحة علی ان علیاً رضی اللّٰه عنه قد کان احسن مثال حی لنور القراٰن و حکمته و علمه و هدایة و اعجازه و فصاحته اجتمع لعلی فی هذا الکتاب مالم یجتمع لکبار الحکمأ و افذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانیین من اٰیات الحکمة السامیه و قواعد السیاسیة المستقیمة و من کل موعظة باهرة و حجة بالغة تشهدله بالفضل و حسن الاثر خاض علی فی هذ الکتاب لجّة العلم و السیاسة و الدین فکان فی کل هذه المسائل نابغة مبرزاً.

اس میدان میں سب سے آگے حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ تھے اور اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت نہج البلاغہ ہے، جسے اللہ نے ایک واضح حجّت اس کی بنایا ہے کہ علی ابنِ ابی طالبؑ قرآن کے نوراور حکمت اور علم اور ہدایت اور اعجاز اور فصاحت کی بہترین زندہ مثال تھے ان میں حضرت علیؑ کی زبان اور اتنی چیزیں یکجا ہیں، جو بڑے علماء اور یکتائے زمانہ فلاسفہ اور شہرۂ آفاق علمائے ربانیین ان سب کی زبان ملا کر بھی یکجا نہیں ملتیں۔حکمت کی بلند نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد حیرت خیز موعظہ اور موثر استدلال اس کتاب میں علی ابنِ ابی طالبؑ نے علمِ سیاست اور دین کے ہر دریا کی غواصی کی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ان میں سے ہر شعبہ میں یکتائے روزگار تھے۔

۱۵- استاد محمد الزہری الغمر اوی جنہوں نے مرصفی کی مذکورہ بالا شرح پر ایک مقدّمہ تحریر کیا ہے۔اس میں **طبقات الفصحاء** کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

"و لم ینقل عن احد من اهل هذه الطبقات مانقل عن امیرالمومنین علی ابن طالب کرم اللّٰه وجهه فقداشتملت مقالاته علی المواعظ الزهدیة و المناهج السیاسیة و الزواجر االدینیة و الحکم النفسیة و الاداب الخلقیة و الدرر التوحیدیة و الاشارات الغیبیة الردود علی الخصوم و النصائح علیٰ وجه العموم و قد احتوی علی غررکلامه کرام اللّٰه وجهه کتاب نهج البلاغة الذی جمعه و هذبه ابوالحسن محمد بن طاهر المشهور بالشریف الرضی رحمة اللّٰه و اثابه و ارضاه. "

یعنی ان تمام طبقات کے لوگوں میں سے کسی ایک سے بھی وہ کارنامہ نقل ہوکر ہم تک نہیں

پہنچا۔امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی زبانی پہنچا ہے۔ آپ کے مقالاتِ زاہدانہ مواعظ، سیاسی مسلک اور دینی ہدایات، نفیس فلسفی بیانات، اخلاقی تعلیمات،توحید کے جواہر،غیبی اشارات، مخالفین کی ردوقدح اور عمومی نصائح پر مشتمل ہے جو آپ کے کلام کے روشن اقتباسات پر مشتمل کتاب نہج البلاغہ ہے۔ جسے ابوالحسن محمد ابن طاہر مشہور بہ شریف رضی رحمۃ اللہ نے جمع کیا ہے۔

۱۶-الاستاذ عبدالوهاب حموده استاذ الادب والحديث بكلية الاداب جامعه فواد الاول مصر نے اپنے مقالہ الآراء الاجتماعيه فی نهج البلاغة. میں جو رسالۃ الاسلام، قاہرہ کے جلد ۳، عدد ۳ بابت ماہ رمضان ۱۳۷۰ھ مطابق جولائی ۱۹۵۱ھ میں شائع ہوا ہے ۔لکھا ہے کہ ولو اجتمع له رضی اللّٰه عنه فی كتاب نهج البلاغة مايجتمع لكبار الحكماء و افذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانيين من ايات الحكمة السامية، قواعد السياسة المستقيمة ومن كل موعظة باهرة، و حجة بالغة و آراء اجتماعية، و اسس حربية، مما يشهد للامام بالفضل وحسن الاثر. ''

ترجمہ: حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی زبان سے کتاب نہج البلاغہ میں تن تنہا وہ تمام چیزیں اکٹھا ہوگئی ہیں جو اکابر علماء اور یکتائے روزگار فلاسفہ اور سربرآوردہ علمائے ربانیین سے مجموعی طور پر یکجا کی جاسکتی ہیں۔ بلند حکمت کی نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد اور ہرطرح کا حیرت خیز موعظ اور موثر استدلال اور اجتماعی تصورات یہ سب امیرالمومنینؑ کی فضیلت اور بہترین کارگزاری کا بیّن گواہ ہیں۔

۱۷- علاّمہ ابونصر پروفیسر بیروت یونیورسٹی نے اپنی کتاب علی ابن ابی طالبؑ کی فصل ۳۱ میں امیرالمومنینؑ کے آثارِ عربی میں نہج البلاغہ کا ذکر کیا ہے اور اس ذیل میں لکھا ہے کہ یہ کتاب علی ابن ابی طالبؑ کی عظیم شخصیت کی مظہر ہے۔

۱۸- قاضی علی ابن محمد شوانی صاحب نیل الاوطار نے اپنی کتاب"اتحاف الاكابر باسانيد الدفاتر"۔ طبع حیدرآباد (باب النون) میں نہج البلاغہ کے لیے اپنی سند متصّل درج کرتے ہوئے لکھا ہے نهج البلاغه من كلام علی رضی اللّٰه۔ یہ وہ حقیقت ہے،جس کا متعدد عیسائی محققین نے بھی اعتراف کیا ہے۔

۱- عبدالمسیح انطا کی صاحب جریدۂ "العمران" مصر، جنہوں نے امیرالمومنینؑ کی سیرت میں اپنی مشہور کتاب'' شرح قصیدۂ علویہ'' تحریر کی ہے اور وہ مطبع رمسیس فجالہ، مصر میں شائع ہوئی ہے وہ اس

کے ص ۵۳ پر تحریر کرتے ہیں:

" لاجدال ان سیدنا علیاً امیرالمومنینؑ هو امام الفصحآء و استاذ البلغاء و اعظم من خطب و کتب فی حرف اهل هذه الصناعة الالبآء و هذالکلام قد قیل فیه بحق انه فوق کلام الخلق و تحت کلام الخالق قال هذا کل من عرف فنون الکتاب و اشتغل فی صناعة التحییر و التحریر بل هوّ استاذ کتاب العرب و معلمهم بلا مرآء فما من ادیب لبیب حاول اتقان صناعة التحریر الادبین یدیه القرآن و نهج البلاغة ذاک کلام الخالق وهذا کلام اشرف المخلوقین و علیهما یعوّل فی التحریر و التحبیراذا اراد ان یکو ن فی معاشر الکتبة المجیدین و لعل افضل من خدم لغة قریش الشریف الرضی الذی جمع خطب و اقوال و حکم و رسائل سیدنا امیرالمومنین من اقواه الناس وامالیهم واصاب کل الاصابة باطلاقه علیه اسم"نهج البلاغة" و ما هذا الکتاب الا صراط المستقیم لمن یحاول الوصول من معاشر المتادِبین."

یعنی اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ سیّدنا حضرت علی امیرالمومنینؑ فصیحوں کے امام اور بلیغوں کے استاد اور عربی زبان میں خطابت اور کتابت کرنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت ہیں اور یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہ کلامِ مخلوق سے بالاتر اور کلام خالقِ سے نیچے ہے۔ یہ ہراس شخص کا قول ہوگا جس نے انشاء پردازی کے فنون سے واقفیت حاصل کی ہو اور تحریر کا مشغلہ رکھا ہو بلکہ آپ بلاشبہ تمام عرب انشاء پردازوں کے استاد اور معلم ہیں۔ کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو تحریر کے فن میں کمال حاصل کرنا چاہے، مگر یہ کہ اس کے سامنے قرآن ہوگا۔ اور نہج البلاغہ کہ ایک خالق کا کلام ہے اور دوسرا اشرف المخلوقین کا اور انہیں پر اعتماد کرے گا ہر وہ شخص جو چاہے گا کہ اچھے لکھنے والوں میں اس کا شمار ہو، غالبًا زبانِ عربی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے بڑا درجہ شریف رضیؒ کا ہے جنہوں نے امیرالمومنینؑ کے یہ خطبے اور اقوال اور حکیمانہ ارشادات اور خطوط لوگوں کے لئے محفوظات اور مخطوطات سے یکجا کیے ہیں،اور انہوں نے اس کا نام" نہج البلاغہ" بھی بہت ٹھیک رکھا۔ بلا شبہ یہ بلاغت کا صراط مستقیم ہے ہراس شخص کے لیے جو اس منزل تک پہنچنا چاہے۔

اس کے بعدانہوں نے شیخ محمدعبدہ کی رائے بیان کی ہے اور اس کے بعدلکھاہے کہ ایک مرتبہ شیخ ابراہیم یازجی نے جو اس آخری دور میں متفقہ طور پرعربی کے کامل انشاء پرداز اور امامِ اساتذہ لغت مانے گئے ہیں مجھ سے فرمایا کہ مجھے اس فن میں جو مہارت حاصل ہوئی ہے، وہ صرف قرآن مجید اور

نہج البلاغہ کے مطالعہ سے یہ دونوں عربی زبان کے وہ خزانہ عامرہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

۲- فواد افرام البستانی، استاذ الآداب العربیة فی کلیة القدیس یوسف (بیروت) انہوں نے ایک سلسلہ تعلیمی کتابوں کا روائع کے نام سے شروع کیا ہے جس میں مختلف جلیل المرتبہ مصنّفین کے آثار قلمی اور تصانیف سے مختصر انتخابات، مصنف کے حالات، کمالات، کتاب کی تاریخی تحقیقات وغیرہ کے ساتھ چھوٹے مجموعوں کی صورت میں ترتیب دیئے ہیں اور وہ کیتھلک عیسائی پریس (بیروت) میں شائع ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مجموعہ امیرالمومنینؑ اور نہج البلاغہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں مولف نے اپنے مقدمہ میں تحریر کیا ہے:

"اننا نبدأ الیوم بنشر منتخبات من نهج البلاغة للامام علی ابنِ ابی طالبؑ اوّل مفکری الاسلام."

یعنی ہم سب سے پہلے اس سلسلہ کی ابتدا کرتے ہیں نہج البلاغہ کے انتخابات کے ساتھ جو اسلام کے سب سے پہلے مفکر امام علی ابنِ علی طالبؑ کی کتاب ہے۔

اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوا ہے جو سلسلۂ روائع کی پہلی قسط ہے۔ اس کا پہلا عنوان ہے۔ ''علی ابنِ ابی طالبؑ'' جس کے مختلف عناوین کے تحت میں امیرالمومنینؑ کی سیرت اور ان کی خصوصیات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو ایک عیسائی کی تحریر ہوتے ہوئے پورے طور سے شیعی نقطۂ نظر کے موافق نہ سہی، لیکن پھر بھی حقیقت وانصاف کے بہت سے جوہر اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ دوسرا عنوان ہے ''نہج البلاغہ'' اور اس کے ذیلی عناوین میں ایک عنوان ہے ''جمعہ'' دوسرا عنوان ہے۔ ''صحة نسبته''۔ اس کے تحت میں لکھا ہے۔ ''نہج البلاغہ'' کے جمع وتالیف کو بہت زمانہ نہیں گزرا تھا کہ بعض اہلِ نظر اور موّرخین نے اس کی صحت میں شک کرنا شروع کیا جن کا پیشرو ابنِ خلکان ہے جس نے اپنی کتاب کو اس کے جامع کی طرف منسوب کیا ہے اور پھر صفدی وغیرہ نے اس کی پیروی کی اور پھر شریف رضی کے بسا اوقات اپنے دادا مرتضٰی کے لقب سے یاد کئے جانے کی وجہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو گیا۔ اور وہ ان میں اور ان کے بھائی علی بن طاہر معروف بہ سیّد مرتضٰی متولّد ۹۶۶ء متوفّی ۱۰۴۴ء میں تفرقہ نہ سمجھ سکے اور انہوں نے نہج البلاغہ کے جمع کو ثانی الذّکر کی طرف منسوب کر دیا۔ جیسا کہ جرجی زیدان نے کیا ہے اور بعض لوگوں نے جیسے مستشرق کلیان نے یہ طرہ کیا کہ اصل مصنف کتاب کا سیّد مرتضٰی ہی کو قرار دے دیا۔ ہم جب اس شک کے وجوہ واسباب پر غور کرتے ہیں تو وہ ہر پھر کے پانچ

امر ہوتے ہیں۔

اس کے بعدانہوں نے شک کے تقریباً وہی اسباب تحریر کئے ہیں جو ان کے پہلے محی الدین عبدالحمید شارح نہج البلاغہ کے بیان میں گزر چکے ہیں اور پھرانہوں نے ان وجوہ کو رد کیا ہے۔

۳- بیروت کے شہرۂ آفاق مسیحی ادیب اور شاعر پولس سلامہ اپنی کتاب ''اول ملحمه عربيه عيدالغدير'' میں جو مطبعۃ النسر بیروت میں شائع ہوئی ہے۔صفحہ ۷۱، ۷۲ پر لکھتے ہیں۔

''نہج البلاغہ'' مشہورترین کتاب ہے،جس سے امام علی علیہ السّلام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کتاب سے بالاتر سوا قرآن کے اور کسی کتاب کی بلاغت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعدحسبِ ذیل اشعار نہج البلاغہ کی مدح میں درج کئے گئے ہیں:

هذه الكهف للمعارف باب مشرع من مدينة الاسرار
تنثرالدر فی كتاب مبين سفر نهج البلاغة المختار
هوروض من كل زهرجنی اطلعته السماء فی نوّار
فيه من نضرةالورد العذاری والخزامی و الفدّ و الجلنار
فی صفاء الينبوع يجری زلالا كو ثر ارائقا بعيد القرار
تلمع الشط والضفاف ولكن بالعجز العيون فی الاغرار

یہ معارف وعلوم کا مرکز اور اسرار و رموز کا کھلا ہوا دروازہ ہے۔ یہ نہج البلا غہ کیا ہے ایک روشن کتاب میں بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ یہ چنے ہوئے پھولوں کا ایک باغ ہے جس میں پھولوں کی لطافت چشموں کی صفائی اور آب کوثر کی شیرینی جس نہر کی وسعت اور کنارے تو آنکھوں سے نظر آتے ہیں مگر تہ تک نظریں پہنچنے سے قاصر ہیں۔